جلد ۵ عدد ۳
رمضان ۱۳۵۳ھ

رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲۰

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ
سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (عہ۵ر) بیرون ہند کے لیے (ہئے ر) قیمت فی پرچہ ۸ر

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

کتاب کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے اسکے ابتدائی تین ابواب کی فہرست مضامین ملاحظہ ہو

(۱) **اسلامی جہاد کی حقیقت** - انسانی جان کا احترام - دنیا پر اسلامی تعلیم کا اخلاقی اثر - قتل بالحق و قتل بالحق و بغیر حق کا فرق - ناگزیر خونریزی - اجتماعی فتنہ اور اس کا علاج - جنگ ایک اخلاقی فرض - جنگ کی مصلحت - جہاد فی سبیل اللہ کے معنی - حق و باطل کی حد بندی - جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت - فضیلت جہاد کی وجہ - نظام تمدن میں جہاد کا درجہ

(۲) **مدافعانہ جنگ** - دفاع کی ضرورت و اہمیت - دفاع ایک مذہبی فریضہ - مدافعانہ جنگ کی صورتیں :-

(۱) راہ حق کی حفاظت (۲) عذر و عہد شکنی کی سزا (۳) گھر کے بھیدیوں اور اندرونی دشمنوں کا استیصال (۴) دارالاسلام کے امن کی حفاظت (۵) مظلوم مسلمانوں کی حمایت - دفاع کی اصلی غرض - استعداد قوت کی دائمی تاکید -

(۳) **مصلحانہ جنگ** - مسلمانوں کی زندگی کا اصلی مقصد - اجتماعی فرائض کا اخلاقی تصور - اجتماعی فرائض کا اسلامی تصور - امر بالمعروف و نہی عن المنکر - حیات اجتماعی میں اس کا درجہ - امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرق - نہی عن المنکر کا طریقہ - فتنہ و فساد کے خلاف جنگ - فتنہ کی تحقیق - فساد کی تحقیق - حکومت الٰہی کے قیام کی ضرورت - قتال کا حکم - قتال کی غرض و غایت - جزیہ کی حقیقت - قتال کی آخری حد - اسلام اور جہانگیری - اسلامی فتوحات کی توجیہہ - حکومت صرف صالحین کا حق ہے ۔

قیمت بلا جلد للعہ سکہ انگریزی للحہ ۱۲ سکہ عثمانیہ
مجلد صہ ،، ،، صعہ ۱۲ ،، ،،

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

فہرست مضامین

ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۳ھ جلد ۵ عدد ۳

اشارات	ابوالاعلیٰ مودودی	۱۶۲
مقالات:-		
کتب سماوی پر ایک نظر	جناب ذوقی شاہ صاحب	۱۶۹
اسلام اور سائنس	چوہدری غلام احمد صاحب پرویز	۱۸۴
تنزیل و تاویل:-		
سورۃ البقرہ	جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی	۲۰۷
من و سلویٰ	جناب مولانا عبداللہ العمادی	۲۱۹
حاملان قرآن:-		
قاضی طیب عمادی	جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی	۲۲۵
رسائل و مسائل:-		
حدیث لاتسبوا الدھر	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۳۲
مطبوعات	ا۔ خ۔ م	۲۴۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اجتماعی نظم، خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو، اور کسی غرض وغایت کے لیے ہو، اپنے قیام و استحکام اور اپنی کامیابی کے لیے دو چیزوں کا ہمیشہ محتاج ہوتا ہے:۔

ایک یہ کہ جن اصولوں پر کسی جماعت کی تنظیم کی گئی ہو وہ اس پوری جماعت اور اس کے ہر ہر فرد کے دل و دماغ میں خوب بیٹھے ہوئے ہوں اور جماعت کا ہر فرد ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتا ہو۔

دوسرے یہ کہ جماعت میں سمع و طاعت کا مادّہ موجود ہو، یعنی اس نے جس کسی کو اپنا صاحب امر تسلیم کیا ہو، اس کے احکام کی پوری طرح اطاعت کرے، اس کے مقرر کیے ہوئے ضوابط کی سختی کے ساتھ پابند رہے، اور اس کے حدود سے تجاوز نہ کرے۔

یہ ہر نظام کی کامیابی کے لیے ناگزیر شرطیں ہیں۔ کوئی نظام خواہ وہ نظام عسکری ہو، یا نظام سیاسی، یا نظام عمرانی، یا نظام دینی، ان دونوں شرطوں کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ باقی رہ سکتا ہے اور نہ اپنے مقصد کو پہنچ سکتا ہے۔

دنیا کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ جائیے۔ آپ کو ایک مثال بھی ایسی نہیں ملیگی کہ کوئی تحریک تھُڑدلے، منافق، نافرمان اور غیر مطیع پیروؤں کے ساتھ کامیاب ہوئی ہو، یا بدرجۂ آخر چل سکی ہو۔ تاریخ کے صفحات میں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ خود اپنے گرد و پیش کی دنیا ہی پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ آپ اس فوج کے متعلق

کیا ایسے قائم کریں گے جو اپنی سلطنت کی وفادار اور اپنے سالار لشکر کی مطیع فرمان نہ رہے۔ جس کے سپاہی فوجی ضوابط کی پابندی سے انکار کردیں، پریڈ کا بگل بجے تو کوئی سپاہی اپنی جگہ سے نہ ہلے، کمانڈر کوئی حکم دے تو سپاہی سنی ان سنی کر جائیں؟ کیا آپ سپاہیوں کے ایسے انبوہ کو "فوج" کہہ سکتے ہیں؟ کیا آپ امید کرسکتے ہیں کہ ایسی بن سری فوج کسی جنگ میں کامیاب ہوگی؟ آپ اس سلطنت کے متعلق کیا کہتے ہیں جس کی رعایا میں قانون کا احترام باقی نہ رہے، جس کے قوانین علی الاعلان توڑے جائیں، جس کے محکموں میں کسی قسم کا ضبط و نظم باقی نہ رہے، جس کے کارکن اپنے مقتدر اعلیٰ کے احکام بجا لانا چھوڑ دیں؟ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی رعایا اور ایسے عُمّال کے ساتھ کوئی سلطنت دنیا میں قائم رہ سکتی ہے؟ آج آپ کی آنکھوں کے سامنے جرمنی اور اٹلی کی مثالیں موجود ہیں۔ ہٹلر اور مسولینی نے جو عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے تمام دنیا اس کی معترف ہے۔ مگر کچھ معلوم بھی ہے کہ اس کامیابی کے اسباب کیا ہیں؟ وہی دو، یعنی ایمان اور اطاعت امر۔ نازی اور فاسسٹ جماعتیں ہرگز اتنی طاقتور اور اتنی کامیاب نہیں ہوسکتی تھیں اگر وہ اپنے اصولوں پر اتنا پختہ اعتقاد نہ رکھتیں اور اپنے لیڈروں کی اس قدر سختی کے ساتھ مطیع نہ ہوتیں۔ دوسری طرف ہندوستان کو دیکھیے۔ کانگریس کی تحریک دو مرتبہ کس زور شور سے اٹھی اور آخر کار ناکامی و نامرادی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ تحریک کے علمبردار نے خود اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس کے پیرووں میں نہ تو اس کے اصولوں پر کامل اعتقاد تھا، اور نہ اس کے احکام کی پوری اطاعت۔

یہ قاعدۂ کلیہ ایسا ہے جس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ ایمان اور اطاعت در اصل نظم کی جان ہے۔ ایمان جتنا راسخ ہوگا اور اطاعت جتنی کامل ہوگی، نظم اتنا ہی مضبوط اور طاقتور ہوگا۔ اور اپنے مقاصد تک پہنچنے میں اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوگا۔ بخلاف اس کے ایمان میں جتنا ضعف اور اطاعت سے جتنا انحراف ہوگا، اُسی قدر نظم کمزور ہوگا اور اسی نسبت سے وہ اپنے مقاصد تک پہونچنے میں ناکام رہے گا۔

یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی جماعت میں نفاق، بدعقیدگی، انتشار خیال، خودسری، نافرمانی اور بے ضابطگی کے امراض پھیل جائیں، اور پھر بھی اس میں نظم باقی رہے، اور وہ کسی شعبۂ حیات میں ترقی کی طرف رواں نظر آئے۔ یہ دونوں حالتیں ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ دنیا جب سے آباد ہوئی ہے، اس وقت سے آج تک ان دونوں کا کبھی اجتماع نہیں ہوا۔ اور اگر قانون فطرت اٹل ہے، تو اس قانون کی یہ دفعہ بھی اٹل ہے کہ یہ دونوں حالتیں کبھی یکجا جمع نہیں ہوسکتیں۔

اب ذرا اس قوم کی حالت پر نظر ڈالیے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے۔ نفاق اور بدعقیدگی کی کونسی قسم ایسی ہے جس کا انسان تصور کرسکتا ہو، اور وہ مسلمانوں میں موجود نہ ہو۔ اسلامی جماعت کے نظام میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اسلام کی بنیادی تعلیمات تک سے ناواقف ہیں اور اب تک جاہلیت کے عقائد پر جمے ہوئے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو اسلام کے اساسی اصولوں میں شک رکھتے ہیں اور شکوک کی علانیہ تبلیغ کرتے ہیں، وہ بھی ہیں جو علی الاعلان انکار کرتے ہیں، وہ بھی ہیں جو اسلامی عقائد اور شعائر کا کھلم کھلا مذاق اڑاتے ہیں، وہ بھی ہیں جو علانیہ مذہب اور مذہبیت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول کی تعلیمات کے مقابلہ میں کفار سے حاصل کیے ہوئے تخیلات و افکار کو ترجیح دیتے ہیں، وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول کے قانون پر جاہلیت کے رسوم یا کفار کے قوانین کو مقدم رکھتے ہیں، وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول کے دشمنوں کو خوش کرنے کے لیے شعائر اسلامی کی توہین کرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو اپنے چھوٹے سے چھوٹے فائدے کی خاطر اسلام کے مصالح کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، جو اسلام کے مقابلہ میں کفر کا ساتھ دیتے ہیں، اسلامی اغراض کے خلاف کفار کی خدمت کرتے ہیں، اور اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ اسلام انکو اتنا بھی عزیز نہیں کہ اسکی خاطر وہ ایک بال برابر بھی نقصان گوارا کرسکیں۔ راسخ الایمان اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کی ایک نہایت ہی قلیل جماعت کو چھوڑ کر اس قوم کی بہت بڑی اکثریت اسی قسم کے منافق اور فاسد العقیدہ لوگوں پر مشتمل ہے۔

یہ تو تھا ایمان کا حال۔ اب سمع و طاعت کا حال دیکھیے۔ آپ مسلمانوں کی کسی بستی میں چلے جائیے۔ آپ کو عجیب نقشہ نظر آئے گا۔ اذان ہوتی ہے مگر بہت سے مسلمان یہ بھی محسوس نہیں کرتے کہ موذن کس کو بلا رہا ہے اور کس چیز کے لیے بلا رہا ہے۔ نماز کا وقت آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ مگر ایک قلیل جماعت کے سوا کوئی مسلمان اپنے کاروبار یا لہو ولعب کو یاد خدا کے لیے نہیں چھوڑتا۔ رمضان کا زمانہ آتا ہے تو بعض مسلمانوں کے گھروں میں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ بہت سے مسلمان علانیہ کھاتے پیتے ہیں اور اپنے روزہ نہ رکھنے پر ذرہ برابر نہیں شرماتے، بلکہ بس چلتا ہے تو اُلٹا روزہ رکھنے والوں کو شرم دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جو لوگ روزہ رکھتے بھی ہیں ان میں سے بھی بہت کم ہیں جو احساس فرض کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ ورنہ کوئی محض رسم ادا کرتا ہے، کوئی صحت کے لیئے مفید سمجھ کر رکھ لیتا ہے اور کوئی روزہ رکھ کر وہ سب کچھ کرتا ہے جس سے خدا اور اُس کے رسول نے منع کیا ہے۔ زکوٰۃ اور حج کی پابندی اس سے بھی کم تر ہے۔ حلال و حرام، پاک اور ناپاک کا امتیاز تو مسلمانوں میں سے اُٹھتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ کون سی چیز ہے جس کو خدا اور رسول نے منع کیا ہو اور مسلمان اسکو اپنے لیے مباح نہ کر لیتے ہوں۔ وہ کون سی حد ہے جو خدا اور رسول نے مقرر کی ہو اور مسلمان اس سے تجاوز نہ کرتے ہوں۔ وہ کون سا ضابطہ ہے جو خدا اور رسول نے قائم کیا ہو اور مسلمان اس کو نہ توڑتے ہوں۔ اگر مردم شماری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلمان کروڑوں ہیں، مگر ان کروڑوں میں دیکھیے کہ کتنے فی صدی نہیں، کتنے فی ہزار، بلکہ کتنے فی لاکھ خدا اور رسول کے احکام کو ماننے والے اور اسلامی ضوابط کی پابندی کرنے والے ہیں؟

جس قوم میں منافقت اور ضعف اعتقاد کا مرض عام ہو جائے، جس قوم میں فرض کا احساس باقی نہ رہے، جس قوم سے سمع و طاعت اور ضابطہ کی پابندی اُٹھ جائے، اس کا جو کچھ انجام ہونا چاہئیے ٹھیک وہی انجام مسلمانوں کا ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ آج مسلمان تمام دنیا میں محکوم و مغلوب ہیں۔ جہاں ان کی

اپنی حکومت موجود ہے وہاں بھی وہ غیروں کے اخلاقی، ذہنی اور مادّی تسلط سے آزاد نہیں ہیں۔ جہالت، مفلسی، اور خستہ حالی میں وہ ضرب المثل ہیں۔ اخلاقی پستی نے ان کو حد درجہ ذلیل کر دیا ہے۔ امانت، صداقت اور وفائے عہد کی صفات جن کے لیے وہ کبھی دنیا میں ممتاز تھے، اب ان سے دوسروں کی طرف منتقل ہو چکی ہیں، اور ان کی جگہ خیانت، جھوٹ دغا اور بدمعاملگی نے لے لی ہے۔ تقویٰ، پرہیزگاری اور پاکیزگی اخلاق سے وہ عاری ہوتے جاتے ہیں، قومی غیرت و حمیت روز بروز ان سے مفقود ہوتی جاتی ہے، کسی قسم کا نظم ان میں باقی نہیں رہا ہے۔ آپس میں ان کے دل پھٹتے چلے جاتے ہیں اور کسی مشترک غرض کے لیے مل کر کام کرنے کی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی ہے۔ وہ غیروں کی نگاہوں میں ذلیل ہو گئے ہیں، قوموں پر سے ان کا اعتماد اُٹھ گیا ہے اور اُٹھتا جا رہا ہے، ان کی قومی طاقت اور اجتماعی قوت کمزور ہوتی جا رہی ہے، ان کی قومی تہذیب و شائستگی فنا ہوتی چلی جا رہی ہے، اور اپنے حقوق کی مدافعت اور اپنے شرف قومی کی حفاظت سے وہ عاجز ہوتے جا رہے ہیں۔ باوجودیکہ تعلیم ان میں بڑھ رہی ہے، گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ اور یورپ کے تعلیم یافتہ حضرات کا اضافہ ہو رہا ہے، بنگلوں میں رہنے والے، موٹروں پر چڑھنے والے، سوٹ پہننے والے، بڑے بڑے ناموں سے یاد کئے جانے والے، بڑی سرکاروں میں سرفرازیاں پانے والے، ان میں روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں، لیکن جن اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے وہ پہلے متصف تھے اب ان سے عاری ہیں، اپنی ہمسایہ قوموں پر ان کی جو ساکھ اور دھاک پہلے تھی وہ اب نہیں ہے، جو عزت وہ پہلے رکھتے تھے وہ اب نہیں رکھتے، جو اجتماعی قوت و طاقت ان میں پہلے تھی وہ اب نہیں ہے، اور آیندہ اس سے بھی زیادہ خراب آثار نظر آ رہے ہیں۔

کوئی مذہب یا تہذیب ہو یا کسی قسم کا نظام جماعت ہو، اس کے متعلق دو ہی طرز عمل انسان کے لیے معقول ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ اس میں داخل ہو تو اس کے اساسی اصول پر پورا پورا اعتقاد رکھے اور اس کے

قانون وضابطہ کی پوری پوری پابندی کرے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرسکتا تو اس میں داخل نہ ہو یا ہوچکا ہے تو بالاعلان اس میں سے نکل جائے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری صورت معقول نہیں ہے۔ اس سے زیادہ نامعقول کوئی طرزعمل نہیں ہوسکتا کہ تم ایک نظام میں شریک ہو، اس کے ایک جزء بن کر رہو، اس نظام کے تابع ہونے کا دعویٰ کرو، اور پھر اس کے اساسی اصولوں سے کلًّا یا جزءً انحراف بھی کرو، اس کے قانون کی خلاف ورزی بھی کرو، اپنے آپ کو اس کے آداب اور اس کے ضوابط کی پابندی سے مستثنیٰ بھی کرلو۔ اس طرزعمل کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم میں منافقانہ خصائل پیدا ہوں، خلوص نیت سے تمہارے دل خالی ہوجائیں تمہارے قلوب میں کسی مقصد کے لیے گرم جوشی اور رسوخ عزم نہ پیدا ہوسکے، فرض شناسی، اتباعِ قانون اور باضابطگی کے اوصاف سے تم عاری ہوجاؤ، اور تم میں یہ صلاحیت باقی نہ رہے کہ کسی نظام جماعت کے کارآمد رکن بن سکو۔ اِن کمزوریوں اور بدترین عیوب کے ساتھ تم جس جماعت میں بھی شریک ہوگے اسکے لیے لعنت بن جاؤ گے، جس نظام میں داخل ہوگے اسے درہم برہم کردو گے، جس تہذیب کے جسم میں داخل ہوگے اس کے لیے جذام کے جراثیم ثابت ہوگے، جس مذہب کے پیرو بنوگے اسکو مسخ کرکے چھوڑدوگے۔ ان اوصاف کے ساتھ تمہارے مسلمان ہونے سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ جس گروہ کے اصولوں پر تمہارا دل ٹھکے اور جس گروہ کے طریقوں کی تم پوری طرح پیروی کرسکو اس میں جا شامل ہو۔ منافق اور نافرمان مسلمانوں سے وہ کافر بہتر ہیں جو اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے دل سے معتقد ہوں اور اسکے ضوابط کی پابندی کریں۔

جو لوگ مسلمانوں کے مرض کا علاج تعلیم مغربی، اور تہذیب جدید، اور اقتصادی حالات کی اصلاح، اور سیاسی حقوق کے حصول کو سمجھتے تھے وہ غلطی پر تھے، اور اب بھی جو ایسا سمجھ رہے ہیں وہ غلطی کررہے ہیں۔ بخدا، اگر مسلمانوں کا ہر فرد بی۔اے، اور پی ایچ ڈی اور بیرسٹر ہوجائے، دولت و ثروت سے مالامال ہو، مغربی فیشن سے از سرتا بقدم آراستہ ہو، اور حکومت کے تمام عہدے اور کونسلوں

کی تمام نشستیں مسلمانوں ہی کو مل جائیں، مگر ان کے دل میں نفاق کا مرض ہو، وہ فرض کو فرض نہ سمجھیں، وہ نافرمانی سرکشی اور بے ضابطگی کے خوگر ہوں، تو اُسی پستی اور ذلت اور کمزوری میں وہ اس وقت بھی مبتلا رہیں گے جس میں آج مبتلا ہیں تعلیم، فیشن، دولت اور حکومت، کوئی چیز ان کو اس گڑھے سے نہیں نکال سکتی جس میں وہ اپنی سیرت اور اپنے اخلاق کی ان بنیادی کمزوریوں کی وجہ سے گر گئے ہیں۔ اگر ترقی کرنی ہے اور ایک طاقتور با عزت قوم بننا ہے تو سب سے پہلے مسلمانوں میں ایمان اور اطاعت امر کے اوصاف پیدا کرو۔ کہ اس کے بغیر نہ تمہارے افراد میں کیرکٹر پیدا ہو سکتا ہے، نہ تمہاری جماعت میں نظم پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ تمہاری اجتماعی قوت اتنی زبردست ہو سکتی ہے کہ تم دنیا میں سر بلند ہو سکو۔ ایک منتشر جماعت جس کے افراد کی اخلاقی اور معنوی حالت خراب ہو کبھی اس قابل نہیں ہو سکتی کہ دنیا کی منظم اور مضبوط قوموں کے مقابلہ میں سر اُٹھا سکے۔ پھونس کے پولوں کا انبار خواہ کتنا ہی بڑا ہو، کبھی قلعہ نہیں بن سکتا۔

اسلام اور مسلمانوں کے بدترین دشمن وہ ہیں جو مسلمانوں میں بدعقیدگی اور نافرمانی پھیلا رہے ہیں۔ یہ منافقوں کی سب سے زیادہ بری قسم ہے جن کا وجود مسلمانوں کے لیے حربی کافروں سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ یہ باہر سے حملہ نہیں کرتے بلکہ گھر میں بیٹھ کر اندر ہی اندر ڈائنامائٹ بچھاتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کو دین اور دنیا دونوں میں رسوا کرانا چاہتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ وہ تمہیں بھی اسی طرح کا کافر بنانا چاہتے ہیں جس طرح وہ خود ہو گئے ہیں وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً (۴: ۱۲) ان کے شر سے بچنے کی کم سے کم تدبیر یہ ہے کہ جو لوگ دل سے مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں وہ ان سے قطع تعلق کر لیں فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ (۴: ۱۲) ورنہ قرآن مجید نے تو ان کی آخری سزا یہ قرار دی ہے کہ ان سے جنگ کی جائے۔ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ (۴: ۱۲)

کتب سماوی پر ایک نظر

(۱۱)

عہد جدید (اناجیل وغیرہم)

(از جناب ذوقی شاہ صاحب)

افسانۂ صلیب عیسائی علماء کا یہ عقیدہ ہے کہ مسیح علیہ السلام یہودیوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے، صلیب پر چڑھائے گئے، مرنے کے بعد تین دن تک قبر میں دفن رہے، پھر زندہ ہوئے، حواریوں کو نظر آئے، اور آسمان پر اُٹھا لیے گئے۔ اور صلیب پر مسیح کی یہ قربانی عیسائیوں کے تمام عمر کے گناہوں کا کفارہ ہوگئی۔ مگر اناجیل اربعہ پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو ان میں سے ایک بات بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ بیانات میں اس قدر اختلافات ہیں کہ افسانۂ صلیب کا کوئی پہلو ثابت نہیں ہوتا۔ روایت و درایت کی رو سے کوئی بیان تحقیق کی کسوٹی پر قابل اعتماد نہیں پایا جاتا۔

سب سے پہلے گرفتاری کے واقعات کو لیجئے۔ اس واقعہ کی صورت میں اختلاف ہے۔ متی (۲۶: ۴۸ و ۴۹) میں لکھا ہے کہ مسیح کے حواری یہوداہ اسکریوطی نے اپنے ساتھیوں کو گرفتاری مسیح کے لیے یہ علامت قرار دی تھی کہ جسے میں چوموں اُسے گرفتار کر لینا چنانچہ ایسا ہی عمل میں آیا۔ مگر یوحنا (۱۸: ۴تا۸) میں واقعہ اس طور پر درج ہے کہ عیسیٰ نے خود آگے بڑھ کر دو بار اپنے پکڑنے والوں سے کہا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو یسوع میں ہوں۔ وہ لوگ یہ سُنکر پیچھے ہٹے اور زمین پر گر پڑے۔ آخر کار عیسیٰ علیہ السلام نے خود ہی اپنے آپ کو خوب پہچنوا کر اپنے کو گرفتار کرا دیا اور اب ان دو بیانات میں سے ہم کسے سچا سمجھیں ہلانکہ طور پر ان میں سے

ایک بیان غلط ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ دونوں بیان غلط ہوں۔ کیونکہ جب کسی کتاب میں غلطیوں کا احتمال ہوجاتا ہے تو ساری کتاب بے اعتبار ہوجاتی ہے خصوصًا وہ کتاب جسے آسمانی یا الہامی ہونے کا دعویٰ ہو۔

دوسرا اختلاف تعین صلیب بردار میں ہے۔ یوحنا (۱۹: ۱۷) میں ہے کہ یسوع خود اپنی صلیب کو اُٹھا کر لے گئے تھے۔ اور متی (۲۷: ۳۲) اور مرقس (۱۵: ۲۱) اور لوقا (۲۳: ۲۶) میں یہ لکھا ہے کہ مسیح کی صلیب شمعون قرینی سے اُٹھوا کر لے گئے تھے۔ علاوہ اِس اختلاف کے یہاں ایک اور امر بھی قابل غور ہے۔ اسکاٹ صاحب اپنی تفسیر میں زیر آیت ۳۲ باب ۲۷ متی لکھتے ہیں کہ اُس زمانہ کا دستور یہ تھا کہ جس شخص کو صلیب دی جاتی تھی وہ شخص خود ہی اپنی صلیب اُٹھا کر لے جاتا تھا۔ قرآنی تعلیم یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ قتل کئے گئے نہ آپ کو صلیب دی گئی بلکہ اس بارہ میں لوگوں کو شبہ میں ڈال دیا گیا۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۴: ۲۲) عیسائی مصنفین کو اعتراف ہے کہ قبل نزول قرآن بھی عیسائیوں میں چار فرقے ایسے تھے جن کا اعتقاد یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام مصلوب نہ ہوئے تھے بلکہ اُن کی جگہ شمعون قرینی پکڑا گیا اور مصلوب ہوا۔ وہ چار فرقے یہ ہیں:۔ (۱) باسلیدی۔ (۲) سرنھی۔ (۳) کاپوکرانی (۴) الگاسنک جارج سیل بھی قرآن کے انگریزی ترجمہ میں سورہ آل عمران کے رکوع ۵ میں وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ کے تحت ان فرقوں کے وجود اور ان کے بہت قدیم ہونے اور ان کے متذکرہ بالا عقیدہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں سیل صاحب اپنے اسی نوٹ میں برنباس کی انجیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل کرتے ہیں:۔

"اے برنباس میری بات پر یقین کر کہ ہر گناہ کی خواہ وہ کتنا ہی خفیف کیوں ہو خدا بڑی دردناک سزا ضرور دیتا ہے کیونکہ خدا گناہ سے ناراض ہوتا ہے۔ چونکہ میری والدہ اور میرے وفادار شاگردوں کو جو مجھ سے محبت تھی اس میں محبت دنیا کی بھی آمیزش تھی خدائے عادل نے یہی مناسب سمجھا کہ اس جرم کی پاداش میں انھیں اسی دنیا میں رنج دیا جائے تاکہ آخرت میں وہ دوزخ کے شعلوں سے نجات پائیں۔

اور میرا معاملہ یہ ہے کہ اگرچہ میں دنیا میں بے قصور رہا تاہم بعض لوگوں نے مجھے خدا اور خدا کا بیٹا کہا۔ اس لیے مشیت الٰہی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ قیامت کے دن شیاطین میری ہنسی نہ اڑائیں بلکہ اُس کی رضا۔ اسی میں ہوئی کہ یہوداہ کی موت کے ذریعہ سے اسی دنیا میں میری جگ ہنسائی ہو جائے اور ہر شخص یہ گمان کرلے کہ میں نے صلیب پر جان دی اور یہ ساری ہنسی او ہتک اُس وقت تک رہے کہ محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اس دنیا میں آئیں اور ہر ایمان دار کو اس غلطی سے نکالیں۔"

ممکن ہے کہ اسی نوع کے مضامین کی بنا پر انجیل برنباس کو عیسائیوں نے جعلی قرار دیکر موجودہ مطبوعہ کتب مقدسہ سے خارج کر رکھا ہو مگر اکثر قدیم قلمی نسخوں میں یہ انجیل موجود ہے اور نسخہ سینا میں بھی یہ انجیل موجود ہے۔ یہ وہی نسخہ ہے جسے حال ہی میں انگلستان نے ایک لاکھ پونڈ پر خریدا ہے اور جس کا ذکر اس سلسلہ کے مضمون نمبر ۲ میں آچکا ہے۔ سیل صاحب اپنے نوٹ میں لکھتے ہیں کہ یہ عبارت مسلمانوں نے اِس انجیل میں شامل کردی ہے۔ باوجود اس اہتمام کے سیل صاحب نے اس عبارت کو اِس قدر اہمیت دی کہ اپنے نوٹ میں اسے بالکلیہ نقل کردیا اور اپنے اس خیال کی تائید میں نقل کیا کہ نزول قرآن سے بہت قبل عیسائیوں کی متعدد جماعتیں اس عقیدہ پر قائم تھیں کہ مسیح نہ مصلوب ہوئے نہ قتل ہوئے۔ الحاقی اور غلط بیان کو غلط جان کر کوئی معقول پسند شخص اپنی تائید میں اُس بیان کو پیش نہیں کیا کرتا۔ علاوہ بریں جس زمانہ میں انجیل برنباس لکھی گئی اور مشہور ہوئی اور اُسکی نقلیں پھیلیں اُس زمانہ میں ان مسلمانوں کا وجود ہی کہاں تھا کہ مندرجہ بالا عبارت کو انجیل میں شامل کردیتے۔ اگر مسلمانوں نے اپنے وجود میں آنے کے بعد کسی نہ کسی تدبیر سے انجیل میں اس عبارت کو شامل کردیا تو عیسائی اس الزام کے ثبوت میں کسی ایک ہی قدیم نسخۂ انجیل برنباس کو پیش کردیں جس میں یہ عبارت نہ ہو۔ عیسائی دنیا میں یقیناً متعدد نسخے ایسے ہونگے جو محض عیسائیوں ہی کی تحویل میں رہے ہوں گے اور جن تک کسی مسلمان کا ہاتھ نہ پہونچا ہوگا۔ اگر ان نسخوں میں بھی یہ عبارت موجود ہے تو مسلمانوں پر یہ اتہام ظلم ہے

بفرض محال اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے عیسائیوں کی انجیل میں تحریف ہو گئی او عیسائی اب ایک بھی نسخہ ایسا پیش نہیں کر سکتے جو اس تحریف سے بچا ہو تو اس صورت میں بھی عیسائیوں کی کتابیں غیر محفوظ او تحریف شدہ اور ناقابل اعتماد ثابت ہوتی ہیں۔

بہرحال صرف ایک انجیل میں یہ لکھا ہے کہ صلیب اٹھا کر لے جانے والے خود مسیح تھے۔ اسکے مقابلہ میں تین انجیلیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ نہیں بلکہ اس صلیب کا اٹھا کر لے جانے والا شمعون قرینی تھا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ اس زمانہ کا دستور یہی تھا کہ جو صلیب پر لٹکا یا جائے وہی صلیب کو خود اٹھا کر لٹکنے کی جگہ لے بھی جائے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ قدما کی چار جماعتیں یہی کہتی ہیں کہ مصلوب ہونے والا شمعون قرینی تھا نہ کہ مسیح علیہ السلام۔ مزید براں حضرت مسیح کے قول مندرجہ انجیل برناباس پر بھی نظر ڈالی جائے۔ اس کے بعد منصف مزاج حضرات خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ افسانہ صلیب میں صداقت کو کس حد تک دخل ہے۔

تیسرا اختلاف صلیب دیئے جانے کے وقت سے متعلق ہے۔ مرقس (۱۵: ۲۵) میں ہے کہ تیسرا گھنٹہ تھا جبکہ انھوں نے اسے صلیب دی یعنی صبح کے نو (۹) بجے تھے اور یوحنا (۱۹: ۱۴) میں ہے کہ چھٹے گھنٹے کے قریب سولی دی گئی جس کے معنی یا تو یہ ہو سکتے ہیں کہ چھ (۶) بجے صبح سولی ملی یا چھ (۶) گھنٹے دن چڑھے یعنی ۱۲ بجے دوپہر کو۔ متی (۲۷: ۴۶) سے نویں (۹) گھنٹے تک یسوع کا زندہ رہنا پایا جاتا ہے اور اس وقت ان کا بڑے شور سے چلا کر یہ کہنا بیان کیا جاتا ہے کہ :۔ ایلی ایلی لما سبقتنانی،، یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا۔ لاطینی زبان کی ایک کتاب سلیس آنا لسِس کر ونالاجیکا کے باب ۸ صفحہ ۲۰۹ پر لکھا ہے کہ فصح کے دن شام کے وقت انھوں نے اوسے صلیب پر لٹکایا۔ اتنا اہم واقعہ اور اُس میں اس درجہ اختلاف متذکرہ بالا جملہ اوقات مذکورہ کی بے اعتباری پر دلالت کرتا ہے۔

چوتھا اختلاف ان دو چوروں کی بابت ہے جو مسیح کے ساتھ صلیب پر دائیں بائیں لٹکائے گئے تھے۔ متی (۲۷: ۴۴) کا بیان ہے کہ دونوں چور مسیح کو برا کہہ رہے تھے۔ مگر لوقا (۲۳: ۳۹ تا ۴۳) کا

بیان ہے کہ صرف ایک ہی چور آپ کو بُرا کہتا تھا اور دوسرا چور آپ کی تعریف کرتا تھا۔ بعض مفسرین نے ان ہی اختلافات کے دور کرنے کی کوشش کی ہے مگر نتیجہ تشفی بخش نہ نکل سکا۔ مثلاً اسکاٹ صاحب نے اپنی طرف سے ترتیب زمانی وضع کرکے بیانات مختلفہ کو آگے پیچھے اس طرح بیان کر دیا کہ پہلے دونوں چور آپ کو برا کہتے تھے۔ پھر ایک نے برا کہنے سے توبہ کی اور اچھا کہنا شروع کر دیا۔ اس تطبیق بلا دلیل سے کسی کی بھی تشفی نہیں ہوسکتی۔ اس صورت سے تو تمام متضاد و متناقض امور میں تطبیق باہمی دی جاسکتی ہے اور صدق و کذب کا امتیاز ہی اُٹھ جاتا ہے۔

پانچواں اختلاف اُس کتبہ کی عبارت میں ہے جو مسیح کی صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ یوحنا (۱۹:۱۹) میں یہ عبارت درج ہے :۔ "یسوع ناصری یہودیوں کا بادشاہ" متی (۲۷: ۳۷) کی عبارت ہے: "یہ یسوع یہودیوں کا بادشاہ ہے"، ناصری کا لفظ یہاں درج نہیں۔ مرقس (۱۵: ۲۶) اور لوقا (۲۳: ۳۸) میں کتبہ کی عبارت یہ بیان کی گئی ہے کہ "یہودیوں کا بادشاہ ہے"، یعنی یہاں نہ یسوع کا لفظ ہے نہ ناصری کا۔

چھٹا اختلاف اس میں ہے کہ مسیح کو صلیب پر چڑھتے اور جان دیتے کس کس نے دیکھا۔ متی (۲۶: ۵۶) میں لکھا ہے کہ جب مسیح گرفتار ہوئے اسی وقت "سب شاگرد اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے"، تو ظاہر ہے کہ مصلوبی کے وقت شاگردوں میں سے ایک بھی مسیح کے پاس نہ تھا۔ مرقس (۱۴: ۵۰) سے بھی اسی بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ لوقا (۲۳: ۴۹) میں لکھا ہے کہ عورتیں وغیرہ مسیح کے صلیب پانے کے وقت دور سے کھڑی ہوکر سارا حال دیکھ رہی تھیں۔ مگر یوحنا (۱۹: ۲۵) میں لکھا ہے کہ یہ سب لوگ اور عورتیں صلیب کے پاس کھڑی تھیں اور اتنے قریب تھیں کہ مسیح نے اپنی والدہ کو اپنے ایک شاگرد کے سپرد فرمایا۔ اور فرمایا کہ دیکھ یہ تیری ماں ہے۔ ان بیانات میں کس قدر اختلاف ہے ؟

متی (۲۷: ۵۰ تا ۵۵) میں مسیح کے جان بحق تسلیم ہوتے وقت کا منظر یوں کھینچا گیا ہے کہ ہیکل کا

پردا پھٹ گیا اور زمین کانپی اور پتھر تڑخ گئے اور قبریں کھل گئیں اور مردے نکل پڑے اور زندہ ہو گئے۔ متی ہی کا یہ قول ہے کہ مسیح کی گرفتاری کے وقت سب شاگرد مسیح کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ پھر یہ دیکھا کس نے کہ ہیکل کا پردا پھٹ گیا اور زمین کانپی اور مردے قبروں میں سے نکل کر زندہ ہو گئے اور اندھیرا چھا گیا؟ کیا دشمنان مسیح کی شہادت پر یہ سارے واقعات درج انجیل کر دیئے گئے؟ اگر انجیل یوحنّا کے مطابق یوحنا اُس وقت حاضر تھا تو یوحنا نے تو ان باتوں کا ذکر ہی نہیں کیا۔ پھر متی نے یہ جملہ عجائبات کہاں سے دیکھ لیے؟ ایک طرف متی لکھتے ہیں کہ قبروں میں سے مردے نکل کھڑے ہوئے اور زندہ ہو گئے۔ دوسری طرف ایوب (۷: ۹ و ۱۰) میں لکھا ہے کہ جو قبر میں جاتا ہے وہ پھر قیامت تک واپس نہیں آتا۔ اب ان دونوں میں سے اگر ایک بات صحیح ہے تو دوسری یقیناً غلط ہے اور دونوں میں سے ایک قول کی بھی غلطی موجودہ بائیبل پر سے اعتبار اٹھا دینے کے لیے کافی ہے اور جب بائیبل ہی سے اعتبار اُٹھ گیا تو محتاط لوگوں کے نزدیک اُس کا ہر بیان جس کی کہیں خارج سے تائید نہ ہو مشکوک ہے۔

ساتواں اختلاف ان لوگوں کی بابت ہے جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مسیح کو مر کر دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا۔ قرنتیون کے (۱۵: ۵ و ۶) میں پولوس لکھتے ہیں کہ مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا بارہ حواریوں نے دیکھا پھر اس کے بعد، پانچ سَو بھائیوں سے زیادہ تھے جنھیں وہ ایک بار دکھائی دیا" اول تو بارہ حواریوں کی تعداد ہی غلط ہے۔ زمانۂ مسیح میں صرف گیارہ (۱۱) ہی حواری تھے۔ بارہواں حواری مسیح کے آسمان پر جانے کے بعد بذریعہ قرعہ اندازی کے منتخب ہوا ہے جس کی تفصیل کتاب اعمال کے باب اول میں درج ہے۔ پھر اناجیل اربعہ متفق ہیں کہ سوا گیارہ حواریوں کے کسی نے مسیح کو دوبارہ زندہ نہیں دیکھا۔ اعمال (۱۰: ۴۰ و ۴۱) میں بھی صاف لکھا ہے کہ "... اسکو (یعنی مسیح کو) خدا نے تیسرے دن اُٹھایا اور ظاہر کر دکھایا ساری قوم پر نہیں بلکہ ان گواہوں پر کہ آگے سے خدا کے چُنے ہوئے تھے یعنی ہم پر۔" پھر پولوس نے یہ کہاں سے کہہ دیا کہ پانچسو بھائیوں سے زیادہ تھے جنھیں وہ ایک بار دکھائی دیا۔ اعمال (۱: ۱۵) کی رو سے شاگردوں کی

تعداد ایکسو بیس (۱۲۰) سے زائد نہ تھی۔ یہ تعداد عروج مسیح سے بعد کی ہے۔ کہ وقوع صلیب سے قبل کی قبل کی تعداد تو اس سے بھی کم ہوگی۔ پولوس کے یہ پانچسو سے زائد بھائی کہاں سے پیدا ہوگئے جنھوں نے مسیح کی حیات ثانی کا مشاہدہ کرلیا کیا متی اور یوحنا اور پطرس وغیرہم جو مسیح کے مقرب حواری تھے پولوس کے پانچسو بھائیوں میں شامل نہ تھے کہ یہ بھی اپنی تصانیف میں کچھ اس کا ذکر کرتے۔ بقول مسیحی علماء کے لوقا اور مرقس نے پولوس اور پطرس ہی کی تعلیم سے اپنی اپنی انجیلیں لکھیں مگر ان دونوں نے بھی یہ بات کہیں نہ لکھی لوقا نے خاص طور پر پولوس ہی سے پوچھ پوچھ کر مسیح کا حال لکھا مگر باوجود اس کے یہی لکھا کہ صرف گیارہ حواریوں ہی نے مسیح کی حیات ثانی کا مشاہدہ کیا۔ اس نے نہ بارہ حواریوں کا ذکر کیا نہ پانچسو سے زائد بھائیوں کا۔

اب جنھیں اس حیاتِ ثانی کا مشاہدہ ہوا ان کی بابت بھی مختلف بیانیاں ذرا ملاحظہ ہوں۔

یوحنا (۲۰: ۱۴) میں لکھا ہے کہ مریم مگدلینی نے مسیح کو مصلوبی کے تیسرے دن دیکھا مگر نہ پہچانا۔

لوقا (۲۴: ۴ و ۵ و ۶) میں لکھا ہے کہ مریم مگدلینی نے فرشتوں سے یسوع کے جی اٹھنے کا حال سنکر شاگردوں کو خبر دی تھی مگر یوحنا (۲۰: ۱ و ۲ و ۱۴) سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریم مگدلینی کو مسیح کے جی اٹھنے کی خبر نہ تھی اور جب تک کہ مسیح کو مرنے کے بعد زندہ نہ دیکھا یہی سمجھا تھا کہ مسیح کی نعش کو کوئی قبر سے نکال کرلے گیا ہے اور جب مسیح کو دیکھا بھی تو اولھیں نہ پہچانا بلکہ یہی سمجھا کہ کوئی باغبان ہے۔ مرقس (۱۶: ۹) میں ہے کہ یسوع قبر سے جی اٹھنے کے بعد پہلے مریم مگدلینی کو دکھائی دیے۔ لوقا (۲۴: ۱۳ و ۳۴) میں ہے کہ پہلے دو مردوں کو یا شمعون کو دکھائی دیا۔ متی (۲۸: ۹) میں ہے کہ مریم نے یسوع کو دیکھ کر ان کے قدم پکڑے مگر یوحنا (۲۰: ۱۷) میں ہے کہ یسوع نے کہا کہ مجھ کو مت چھوو کیونکہ میں ہنوز اوپر اپنے باپ کے پاس ابھی نہیں گیا۔ پھر یوحنا (۲۰: ۱۲) میں ہے کہ مریم نے دو فرشتے یسوع کی قبر میں بیٹھے دیکھے۔ لوقا (۲۴: ۴) میں ہے کہ دو شخص اپنے پاس کھڑے دیکھے۔ مرقس (۱۶: ۵) میں ہے کہ ایک جوان کو سفید پوشاک پہنے ہوئے قبر میں بیٹھے دیکھا۔ متی (۲۸: ۲) میں ہے کہ ایک فرشتے کو قبر کے باہر پتھر پر بیٹھے دیکھا۔ اب خیال فرمائیے کہ ایک ہی واقعہ کو چاروں انجیلوں

میں چار مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ بیانات میں اختلاف کی اس سے زیادہ بین مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

پھر مرقس باب ۱۶ اور لوقا باب ۲۴ میں جو لکھا ہے کہ عورتیں تیسرے دن خوشبو لے کر قبر پر گئیں کہ یسوع کی نعش پر وہ خوشبو ملیں یہ صریحاً غلط ہے۔ کیونکہ بقول اناجیل ہی کے قبر پر ایک بھاری پتھر رکھا گیا تھا اور اُس پتھر پر مہر لگادی گئی تھی اور رومی سپاہیوں کا وہاں بہت سخت پہرا بٹھا دیا گیا تھا۔ اس پہرہ کا باعث یہ تھا کہ یہودیوں کو پہلے سے اس بات کا خوف تھا کہ ایسا نہ ہو کہ عیسائی لوگ مسیح کی نعش کو قبر میں سے چوری سے نکال لے جائیں اور مشہور کر دیں کہ مسیح دوبارہ زندہ ہو گیا تو اس صورت میں فتنہ پہلے فتنے سے شدید تر ثابت ہو گا۔ چنانچہ بعد میں عیسائیوں نے جسے مسیح کا پھر زندہ ہو جانا بیان کیا وہ یہودیوں میں اس مصلوب کی نعش کا چوری ہو جانا مشہور رہے جس کی تائید متی (۲۸: ۱۳ و ۱۴ و ۱۵) سے بھی پوری طرح ہوتی ہے۔ اور رومی سپاہیوں کا پہرہ بہت سخت ہوتا تھا۔ اسکاٹ صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ رومی فوج میں یہ قانون تھا کہ جو سپاہی اپنے پہرے پر سو جائے وہ قتل کر دیا جائے۔ ایسے سخت پہرے کے ہوتے ہوئے وہ عورتیں کیا دیوانی تھیں جو خوشبو لے کر مصلوب کی قبر پر جا پہنچیں۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ انھیں مسیح کے جی اٹھنے کا یقین تھا تو اول تو یہ بات کسی انجیل سے ثابت نہیں ہوتی۔ دوم۔ ایسی صورت میں قبر پر جانے کی کیا ضرورت تھی زندہ شخص کو اب قبر سے کیا تعلق۔ سوم ان عورتوں نے پھر یہ کیوں کہا کہ "ہمارے لیے پتھر کو قبر کے دروازے پر سے کون ڈھلکائے گا"؟۔

متی (۱۲: ۴۰) میں جو یہ قول مسیح سے منسوب کیا گیا ہے کہ میں تین دن زمین کے نیچے رہوں گا وہ قول اگر صحیح ہے تو ممکن ہے کہ اس سے اس جانب اشارہ ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام نے زمین پر تین برس نبوت کا کام کیا اور اس کے بعد اٹھا لیے گئے کیونکہ حزقی ایل (۴: ۶) کی رو سے نبیوں کے ایک دن سے ایک سال مراد ہوتی ہے ڈاکٹر جان مکڈول بھی اپنی کتاب تعلیم الایمان مطبوعہ امریکن مشن لدھیانہ ۱۸۶۹ء کے صفحہ ۱۱۲ پر لکھتے ہیں کہ "اکثر عالموں نے کلام الٰہی کی تفسیر میں ایک دن کو ایک برس تصور کیا ہے اور قدیم یہودی

اور سب مسیحی عالم بھی اسی شمار میں متفق ہیں"۔ اگر قول مسیح سے مندرجہ بالا معنی نہ سمجھے جائیں بلکہ یہ معنی لیے جائیں کہ آپ تین دن قبر میں رہ کر اٹھ کھڑے ہوں گے تو یہ قول غلط ثابت ہو جائے گا کیونکہ اناجیل کی رو سے آپ صرف ایک دن اور دو رات قبر میں رہے۔

جب صلیب ہی کا افسانہ غلط ہے تو مر کر زندہ ہو جانے کا قصہ تو ابھی غلط ہونا چاہیے۔ افسانہ صلیب کی تردید اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ **استثنا** (۲۱: ۲۳) میں لکھا ہے کہ جو لکڑی پر لٹکایا جاتا ہے یعنی جو سولی دیا جاتا ہے وہ خدا کا ملعون ہوتا ہے۔ اگر یہ آیت صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ نے ضرور اپنے پیارے اور برگزیدہ بندے عیسیٰ علیہ السلام کو اس لعنت سے دور اور صلیب پانے سے محفوظ رکھا ہوگا۔ اس کے خلاف اناجیل میں جس قدر واقعات درج ہوں وہ سب الحاقی غلط اور الحاقی ہیں اور ان میں اس قدر اختلافات ہیں کہ وہ سب بیانات پایۂ اعتبار سے گر جاتے ہیں۔

قربانی اور کفارہ اگر عیسائی عقیدہ کے مطابق تھوڑی دیر کے لیے اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ مسیح نے صلیب پائی تو تفتیش طلب مسئلہ یہ باقی رہتا ہے کہ یہ مصلوبی قربانی کیونکر ہو گئی اور اس قربانی کی ضرورت کیا پیش آئی تھی اور یہ دوسروں کے لیے کفارہ کس حد تک ثابت ہو سکتی ہے

اول تو وہ تخیل ہی غلط ہے جس پر قربانی اور کفارہ کے اس عقیدہ کی بنیاد رکھی گئی ہے یہ بات عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے کہ آدم علیہ السلام کے گناہ میں جملہ بنی آدم شریک ہیں۔ آدم سے ایک گناہ ہوا تھا جس کی انھیں دو سزائیں مل چکیں ایک بہشت سے اخراج۔ دوسری موت (پیدائش ۳۔ رومیوں ۵: ۱۲ تا ۱۹۔ اول قرنتیون ۱۵: ۲۱) جب ایک گناہ کی دو سزائیں مل چکی ہیں تو وہ گناہ اب باقی کہاں رہا جو اولاد آدم سینکڑوں ہزاروں پشت تک اس ناکردہ گناہ کی سزا میں مبتلا رہے اگر خروج (۲۰: ۵) کا سہارا ڈھونڈا جائے جس کا مضمون یہ ہے کہ باپ دادا کی بدکاریوں کا بدلہ اولاد سے تیسری اور چوتھی پشت تک لیا جاتا ہے یا **استثنا** (۲۳: ۲) سے مدد لی جائے جس میں لکھا ہے کہ حرامی بچہ اور اس کی دس پشتیں خداوند کی جماعت میں داخل نہیں ہو سکتیں تب بھی مطلب براری نہیں ہو سکتی کیونکہ آدم علیہ السلام کی سینکڑوں ہزاروں پشتیں گزر چکی ہیں یہ خیال بھی غلط ہے کہ موت گناہ کا نتیجہ ہے۔ پرندوں اور جانوروں نے حضرت آدم کی طرح کس نیکی و بدی کی شناخت کے درخت کا پھل کھا لیا تھا جو وہ اور ان کے بچے بھی مرتے ہیں حالانکہ سانپ

آدم کے اس گناہ کا باعث ہوا تھا مگر اس کے نیچے ہزاروں برس تک زندہ رہتے ہیں۔ پھر مسیح کی قربانی اگر کفارہ بن گئی تو مسیح پر ایمان لانے والوں کے لیے چاہئیے تھا کہ موت نہ ہوتی مگر تعجب ہے کہ وہ بھی اسی طرح مرتے ہیں جس طرح مسیح پر ایمان نہ لانے والے۔ آدم کے اس گناہ میں حوّا بھی شریک تھیں بلکہ حوّا ہی نے آدم کو اس گناہ پر ابھارا تھا چنانچہ پیدائش (۳: ۱۶) کی رو سے حوا کو یہ سزا سنائی گئی کہ بچہ پیدا ہوتے وقت عورت دردِ زہ میں مبتلا ہوگی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی عورتیں آج بھی دردِ زہ میں مبتلا ہوتی ہیں اور ان کا مسیح اور مسیح کی قربانی پر ایمان اُنھیں اس درد کی تکلیف سے نجات نہیں دیتا۔ کفارہ کا فائدہ تو یہ ہونا چاہئیے تھا کہ مسیح پر ایمان لانے والے موت سے نجات پاتے اور ایمان لاتے ہی فوراً بغیر مرے بہشت میں داخل ہو جاتے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ لوگوں نے مسیح پر ایمان لانے کے بعد بھی ایسی ایسی تکلیفیں اُٹھائی ہیں جو موت سے بھی شدید تر تھیں۔ عیسائیوں میں ایسے فرقے بھی گزرے ہیں جو اس عقیدہ کو لغو سمجھتے ہیں اور لوگوں کو آدم کی نسل میں ہونے کی بنا پر ناپاک اور گنہگار نہیں تسلیم کرتے اور موت انسانی کو آدم کے گناہ کی سزا نہیں قرار دیتے۔

دوسرا امر قابلِ غور یہ ہے کہ ایک طرف تو بائبل میں یہ لکھا ہے کہ: "وہ جو جان کے لیے کفارہ دیتا ہے سو لہو ہے" (احبار ۱۷: ۱۱) یعنی قربانی کے خون کے بغیر گناہوں کا کفارہ نہیں ہوتا "بغیر لہو بہائے معافی نہیں ہوتی" (عبرانیوں ۹: ۲۲) "وہ (یعنی مسیح) ایک بار ظاہر ہوا کہ اپنے تئیں قربانی کرنے سے گناہ کو نیست کرے" (عبرانیوں ۹: ۲۶) اور لہو بہانے کی تفسیر علمائے نصاریٰ یہ کرتے ہیں کہ اس قدر خون بہایا جائے کہ موت واقع ہو جائے۔ یعنی ایک طرف تو بائبل میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ بغیر قربانی کا خون بہائے گناہوں کا کفارہ نہیں ہو سکتا اور نجات کی کوئی دوسری تدبیر ممکن نہیں اور مسیح مصلوب نہ ہوئے ہوتے تو جہان میں کوئی نجات نہ پاتا اور خدا کا عدل اور رحم پورا نہ ہوتا۔ اور دوسری طرف اسی بائبل میں ایسی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں کہ صلیب کا قصہ پیش آنے سے قبل بغیر اس کے کہ کوئی قربانی عمل میں آئی ہو یا خون کی ایک بوند بھی زمین پر ٹپکی ہو مسیح نے محض اپنے اختیار سے لوگوں کے گناہ معاف کر دیئے۔ متی (۹: ۲ تا ۶) میں وہ واقعہ درج ہے جبکہ مسیح نے اپنی مصلوبی سے بہت پہلے ایک مفلوج کے گناہ بخش دیئے تھے اور کہا تھا کہ

"ابن آدم (یعنی مسیح) کو زمین پر گناہ بخش دینے کا اختیار ہے"۔ لوقا (۷: ۴۸) میں ہے کہ مسیح نے ایک عورت کے بھی گناہ بخش دیئے تھے حالانکہ قصۂ صلیب ابھی پیش نہ آیا تھا۔ یوحنا (۸: ۱ تا ۱۱) میں ہے کہ مسیح نے ایک زانیہ عورت کو بھی معاف کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ جا اور پھر گناہ نہ کرنا۔ لوقا (۱۹: ۹) میں ہے کہ محصول لینے والوں کے سردار اور متمول ذکی کو بھی نجات کی بشارت دیدی گئی تھی۔ لوقا (۲۳: ۴۳) میں ہے کہ صلیب پر (یعنی ابھی قربانی پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ) مسیح نے ایک چور کے گناہ بخش دیئے تھے۔ متی (۲۰: ۱۵) میں مسیح کا یہ قول درج ہے کہ: "کیا روا نہیں کہ میں اپنے مال میں سے جو چاہوں سو کروں"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم تو اپنی امت کو یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، اس کے بندے اسکی ملکیت ہیں، وہ اپنی ملکیت میں جو چاہے تصرف کر سکتا ہے اور وہ اپنے بندوں کے گناہ معاف کرنے میں کسی قربانی یا کفارے یا کسی اور چیز کا محتاج نہیں اور مندرجہ بالا مثالوں سے اگر وہ صحیح ہیں تو یہ پایا جاتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے یہ اختیار مل گیا تھا کہ وہ جس کے چاہیں گناہ معاف کردیں بغیر اس کے کہ کوئی قربانی کی گئی ہو یا کفارہ ادا کیا گیا ہو۔ پھر مصلوبی اور کفارہ کی حاجت ہی کیا رہی؟

گناہوں کی بخشش نے عیسائیوں میں وہ وسعت اختیار کر رکھی ہے کہ صرف مسیح ہی نہیں بلکہ مسیح کے شاگردوں کو بھی جنت اور دوزخ کی چابی عطا فرمادی گئی تھی حالانکہ ان شاگردوں میں سے ایک بھی مصلوب نہ ہوا تھا۔ یوحنا (۲۰: ۲۳) میں لکھا ہے کہ مسیح نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ: "جن کے گناہوں کو تم بخشوگے ان کے گناہ بخشے جائیں گے اور جنہیں تم نہ بخشوگے نہ بخشے جائیں گے"۔ یوحنا کی رو سے یہ اجازت حواریوں کو مصلوبی کے بعد مسیح کی حیات ثانی میں عطا ہوئی۔ مگر متی (۱۶: ۱۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ مصلوبی سے بہت دن قبل جنت و دوزخ کا یہ اختیار حواریوں کو مل چکا تھا۔ چنانچہ پاپائے روم نے ورثہ میں اس اختیار پر چنگل مارا اور گناہوں کی معافی کی چٹھیاں یروشلم پر لڑنے والے عیسائیوں کو سینکڑوں برس تک تقسیم کیں۔

نہ صرف حواریوں اور ان کے جانشینوں بلکہ ہر عیسائی مرد اور عورت کو اپنی گنہ گار زوجہ یا اپنے گنہ گار شوہر کو دوزخ سے بچالینے کا مرتبہ حاصل ہے (اول قرنتیون ۷: ۱۶) بلکہ عیسائیوں میں کا ہر فرد تنہا اپنی نجات کی آپ ہی تدبیر

کر سکتا ہے (لوقا ۱۰:۲۵ تا ۲۸، متی ۱۲۲:۲۲) ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰ کی مصلوبی اور کفارہ کی قطعًا کوئی حاجت نہ تھی۔

تیسرا امر قابل غور یہ ہے کہ مسیح کی یہ قربانی مسیح پر ایمان لانے والے کے لیے اس کے تمام عمر کے گناہوں کا کفارہ ہوجاتی ہے یا صرف ایمان لانے کے وقت تک کے گناہ ہی معاف ہوتے ہیں؟ اگر تمام عمر کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں تو پھر دین کی پابندی اور عبادت و ریاضت اور یوم السبت کے احترام کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور وہ جملہ پند و نصائح و اوامر و نواہی جن سے کتب مقدسہ پُر ہیں لا یعنی اور بیکار ہو جاتی ہیں۔ اگر ایمان لانے سے قبل ہی کے گناہ معاف ہوتے ہیں تو ایمان لانے سے بعد کے گناہوں کے کفارہ کے لیے اسے دوسری قربانی کرنی پڑے گی۔ اور جب وہ بعد کے گناہوں کو قربانی سے دور کر دیتا ہے تو پہلے کے گناہوں کو بھی خود ہی قربانی سے دور کر سکتا تھا قربانی مسیح کی کیا ضرورت تھی؟ مگر عبرانیوں کے باب ۱۰ آیہ ۲۶ میں یہ عبارت بھی درج ہے کہ:۔

"کیونکہ اس کے کہ ہم نے سچائی کی پہچان حاصل کی ہے جان بوجھ کے گناہ کریں تو پھر گناہوں کے لیے کوئی قربانی باقی نہیں"

بہت کم عیسائی ایسے ہونگے جو عیسائی ہونے کے بعد کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں۔ مندرجہ بالا آیت کی رو سے افسوس ہے کہ اُن کے ان گناہوں کی معافی کی کوئی صورت نہیں۔ ان سے کافر ہی اچھے جو مسیح پر ایمان لاتے ہی گناہوں سے پاک ہوجاتے ہیں۔ ان عیسائیوں کے گناہ تو مسیح پر ایمان لانے سے بھی دور نہیں ہوتے اور کسی دوسری قربانی سے بھی ان گناہوں کا کفارہ ادا نہیں ہوسکتا۔

چوتھا امر قابل توجہ یہ ہے کہ قربانی ہمیشہ عمدہ نفیس بے عیب اور مال طیب کی دی جاتی ہے۔ عیسائی عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ میں کمال الوہیت اور کمال انسانیت دونوں کا اجتماع تھا۔ الوہیت کی حیثیت کو تو قربانی سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوسکتا اور وہ الوہیت ہی کیا ہے جو قربان ہوسکے۔ چونکہ کفارہ انسانی گناہوں کا مقصود تھا اس لیے قربانی انسان ہی کی ہوسکتی تھی اور مسیح صرف انسان کامل ہونے کی حیثیت ہی سے صلیب پر چڑھے اور

قربان ہو گئے۔ مگر عیسائی عقیدہ ہی کے رو سے مسیح بحیثیت انسان ہونے کے بے عیب نہ تھے اور نعوذ باللہ گناہ سے پاک نہ تھے۔ رومیوں (۳ : ۹ تا ۱۲) کا فتویٰ ہے کہ آدم کی اولاد میں کوئی بے گناہ نہیں، کوئی راستباز نہیں کوئی سمجھ دار نہیں، کوئی خدا کا طالب نہیں، سب گمراہ ہیں نکمے ہیں اور بدکار ہیں۔ ایوب (۲۵ : ۴) کا فیصلہ ہے کہ :۔

"وہ جو عورت سے پیدا ہوا ہے کیونکر پاک ٹھہرے" چنانچہ مسیح نے یوحنا اصطباغی (یعنی جان دی بیپٹسٹ) سے بپتسمالیا اور یوحنا صرف توبہ ہی کا بپتسمادیتے تھے اور توبہ گناہوں سے ہوتی ہے (متی باب ۳ مرقس باب ۱) لہٰذا مسیحیوں کے ان اقوال کے بموجب قربانی مسیح بے داغ نہ تھی۔ یہاں صرف مسیحی اقوال ہی سے بحث ہے ورنہ مسلمان تو عیسیٰ علیہ السلام اور تمام دیگر انبیاء کو معصوم قرار دیتے ہیں اور ان گستاخیوں سے لرزتے ہیں جو بعض عیسائی عقائد اور عیسائی تحریروں سے جناب مسیح اور دیگر انبیاء کی شان میں واقع ہوتی ہیں۔

پانچویں بات جو غور طلب ہے یہ ہے کہ عیسائی عقیدہ کے بموجب عیسیٰ علیہ السلام صلیب پانے کے بعد جب جی اٹھے تھے تو انسانیت کے ساتھ آسمان پر گئے۔ کیونکہ مصلوبی کے بعد اگر عیسیٰ علیہ السلام کی انسانیت مفقود ہو گئی یا اس انسانیت نے دوبارہ عود نہ کیا تو جی اٹھنے کے نہ کوئی معنی ہیں نہ جی اٹھنے کا ثبوت۔ الوہیت تو ماورائے موت و حیات ہے۔ مرنے جینے کا اطلاق انسان پر ہوتا ہے مخلوق پر ہوتا ہے عیسیٰ علیہ السلام اپنی اسی انسانیت کے ساتھ جس سے آپ اس دنیا میں متصف تھے اور اپنے اسی انسانی جسم کے ساتھ جس سے اس دنیا میں آپ نے زندگی بسر فرمائی آسمان پر نہ گئے ہوتے تو آسمان پر جانے کی فضیلت ہی کیا تھی۔ یوں تو ہر شخص مرتا ہے اور اس کی روح آسمان پر جاتی ہے مگر یہاں فضیلت تو اس میں تھی کہ حضرت الیاس اور حضرت حنوک (یعنی ادریس) کی طرح حضرت عیسیٰ بھی دنیوی انسانی جسم کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے۔ مصلوبی کے بعد خود مسیح نے لوگوں کو اپنا جسم دکھلایا لوقا (۲۴ : ۳۷ تا ۴۲) کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو جو مصلوبی کے بعد کے زمانہ سے متعلق ہے :۔

"مگر اس نے (یعنی مسیح نے) ان سے کہا کہ تم کیوں گھبراہٹ میں ہو اور کاہے کو تمہارے دلوں میں اندیشے پیدا ہوتے ہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں کو دیکھو کہ میں ہی ہوں اور مجھے چھوؤ اور

دیکھو کیونکہ روح کو جسم اور ہڈی نہیں جیسا مجھ میں دیکھتے ہو۔ اور یہ کہہ کے انھیں اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے۔ اور جب وے مارے خوشی کے اعتبار نہ کرتے تھے اور تعجب تھے تو اس نے ان سے کہا کہ کیا یہاں تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے۔ تب اُنھوں نے بھونی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا اور شہد کا ایک چھتا اُس کو دیا۔ اس نے لے کے اُن کے سامنے کھایا۔"

اسی نوع کی گفتگو مصلوبی کے بعد مسیح اور تھوما میں بھی یوحنا (۲۰:۲۷) میں درج ہے۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مسیح کی انسانیت برقرار ہے اور ان کا دنیاوی جسم قائم و محفوظ ہے تو سولی پر کون چڑھا اور قربان کون ہوا اور قربانی میں نذر کیا چیز ہوئی اور انسانی گناہوں کا کفارہ کیونکر ادا ہو سکا؟ وہ فدیہ بھی فدیہ ہے جو واپس کر دیا گیا ہو؟ وہ قربانی بھی قربانی ہے جو قبول نہ کی گئی اور جسم کو اور جان کو واپس کر دیا گیا؟۔ اور ایسی نامقبول قربانی جو رد کر دی گئی ہو کیا انسانی گناہوں کا کفارہ ہو سکتی ہے جبکہ قربانی کی شرط یہ ہو کہ اس قدر خون بہایا جائے کہ موت واقع ہو جائے؟ بات دراصل یہ ہے کہ اناجیل مروجہ سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی۔ اور جب آپ کو سولی ہی نہیں دی گئی تو مرکر جی اُٹھنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا اور قربانی اور کفارہ کے تخیلات بھی ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔

باوجود جملہ امور مندرجہ بالا کے عیسائی حضرات اسی پر مصر ہوں کہ مصلوبیٔ مسیح کو ثابت کر کے اس قربانی کو اپنے گناہوں کا کفارہ قرار دیں تو انھیں معاملہ کے ذرا اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ قربانی کا فائدہ قربانی گزراننے والے کو ملتا ہے۔ اس قاعدہ کی رو سے قربانی مسیح کا فائدہ صرف یہوداہ اسکریوطی ہی کو پہونچتا ہے جس نے بیش قیمت قربانی گزرانی نہ کہ اُن عیسائیوں کو جو صرف باتیں بناتے رہتے ہیں۔ جب تک کہ ہر عیسائی مسیح کے گرفتار کرانے میں اپنی شرکت ثابت نہ کر دے اس قربانی کے مفاد میں حصہ دار کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اور اگر مسیح کو صرف ایک ہی شخص یعنی یہوداہ اسکریوطی نے گرفتار کرایا اور اس گرفتاری اور قربانی سے لاکھوں کروڑوں عیسائیوں نے فائدہ اُٹھایا اور دوزخ سے نجات پائی اور جنت کے مستحق ٹھہرے تو یہوداہ اسکریوطی نے بہت بڑا کام کیا اور بہت بڑا ثواب کمایا اور بہت اچھا آدمی اُسے سمجھنا چاہیئے اور تمام عیسائیوں کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیئے اور کم از کم اس کے

ذاتی گناہ تو اسی کی گزرانی ہوئی قربانی کے طفیل میں معاف ہو ہی جانے چاہئیں۔ مگر تعجب ہے کہ متی (۲۶: ۲۴) میں مسیح اسی یہوداہ اسکریوطی کی بابت فرماتے ہیں کہ :۔ "اس شخص پر افسوس جس کے ہاتھوں ابن آدم گرفتار کروایا جاتا ہے اگر وہ شخص پیدا نہ ہوتا تو اس کے لیے بہتر تھا"، گویا اپنی امت کے لیے یہ قربانی یہ کفارہ اور گناہوں کی یہ بخشش عام جناب مسیح کو بہت ناگوار گزری اور آپ نے اس قربانی گزراننے والے کے اس دنیا ہی میں ہونے پر تاسف فرمایا۔ پھر یوحنا (۶: ۷۰) میں جناب مسیح یہوداہ اسکریوطی کو شیطان کے لقب سے ملقب فرمانے میں عجائبات قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ایک حیرت میں ڈالنے والی نشانی ہے کہ اس شیطان نے بہشت کا دروازہ ساری خلقت کے لیے کھول دیا۔ ایک شیطان آدم علیہ السلام کے بہشت سے نکلنے جانے کا باعث ہوا۔ دوسرا شیطان اولاد آدم کے بہشت میں جانے کا باعث بنا گویا بہشت سے نکالنا اور بہشت میں لے جانا شیاطین ہی کے اختیار میں ہو گیا۔ عیسائی علماء اگر اپنے موجودہ عقائد پر جن کے لیے اناجیل مروجہ میں بھی کوئی قابل اعتماد تائید نہیں ملتی تو ان جملہ لازمی نتائج کو انھیں طوعًا و کرہًا ماننا پڑیگا اور ان کا مذہب دنیا کے لیے ایک مضحکہ انگیز چیز بن جائے گا۔

مختلف مذاہب پر تنقیدی نظر ڈالنے والوں کے لیے اسکی ضرورت سب سے پہلے ہے کہ وہ اصلی اور حقیقی تعلیم کو بدعات مابعد سے علیحدہ کر کے دیکھیں پھر مختلف مذاہب کی اصلی تعلیمات کا باہمی موازنہ کر کے اُن مذاہب کی حقانیت یا عدم حقانیت کے متعلق رائے قائم کریں۔ اور اگر کسی مذہب زیر تفتیش میں انھیں لغویات اور بیہودگیوں سے سابقہ پڑے تو اس غلط نتیجہ پر نہ پہنچ جائیں کہ ہر مذہب ایسی ہی کچھ لغویات اور بیہودگیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ سچ اس جہان سے مفقود نہیں ہوا اور سچا مذہب لغویات اور توہمات و ظنیات و رسمیات لایعنی سے اب بھی محفوظ ہے اور آیندہ بھی محفوظ رہے گا صرف چشم حق بین کی ضرورت ہے۔

(باقی)

"اِسْلام اور سائنِسْ"

(از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز۔ بی۔ اے۔ ہوم ڈپارٹمنٹ۔ دہلی)

(جمعیت انصار المسلمین شملہ کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۶ء میں عنوان بالا پر میں نے ایک تقریر کی تھی۔ احباب کا اصرار ہے کہ اسے محفوظ کر لیا جائے۔ اس لیے ذہن پر زور دیکر اسے ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ممکن ہے اس میں بعض باتیں ایسی بھی آگئی ہوں جو میرے بعض مضامین میں کہیں شائع ہو چکی ہوں۔ لیکن چونکہ مقصود اسی تقریر کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا ہے۔ اس لیے تکرار و توارد کے احتساب سے درگذر کرتا ہوں۔ پرویز)

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

میرے واجب الاحترام بزرگو! اور عزیز بھائیو! جیسا کہ آپ کو اس جلسہ کے پروگرام سے معلوم ہو گیا ہو گا مجھے جس موضوع پر آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہے وہ "اسلام اور سائنس" ہے۔ سائنس سے مراد علم الکیمیا اور طبعیات ہی نہیں جیسا کہ اس لفظ کے اطلاق سے بالعموم ذہن منتقل ہو جایا کرتا ہے، بلکہ یہ لفظ اپنی جامعیت کے اعتبار سے تمام ان علوم و فنون پر حاوی ہے جن کا تعلق مشاہدات حسی و عقلی سے ہے۔ خواہ وہ جمادیات سے متعلق ہوں یا نباتات سے، عالم حیوانات سے ان کا علاقہ ہو یا خود نفس انسانی سے۔ اس کرۂ عناصر کے خواص و طبائع کا تجزیہ کریں یا پھر کارزین رانکو ساختہ، اجرام فلکی کے متعلق معلومات بہم پہونچائیں، یہ علم اور علوم کے تمام شعبے سائنس ہی کہلائیں گے۔ پھر اسلام اور علوم دنیوی کے عنوان پر عام طور پر جو کچھ کہا جاتا ہے یا لکھا جاتا ہے اس سے مقصد صرف اس قدر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے

درخشندہ عہد ترقی کے چند خوشگوار مناظر سامنے لاکر یہ نظر فریب اطمینان دلادیا جائے کہ خیر اگر آج اور قومیں تحصیل علوم وفنون میں ترقی کر رہی ہیں تو کبھی تم بھی اس میدان کے مرد رہ چکے ہو۔ اور داستان کے اس خواب آور اثر سے قوم کو تھپک تھپک کر سلادیا جائے۔ اگرچہ میں بھی کچھ ایسی ہی تفصیلات پیش کروں گا جو عام طور پر کی جاتی ہیں۔ اور مجھے بھی کچھ ایسے ہی سحر کار مناظر سامنے لانے ہونگے جو تاریخ کے اوراق پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن میں ان کیفیات و مناظر کو کسی اور زاویہ سے دکھانا چاہتا ہوں اور میرے نتائج مستخرجہ افسون خواب آور ہونے کی بجائے اہل بصیرت کے لیے عبرت وموعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھیں گے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

برادران! یوں تو دنیا کی جس چیز پر نگاہ ڈالیے تغیر و تبدل کے ایک لامتناہی سلسلہ کی جولانگاہ نظر آئے گی۔ سائنس کی تحقیقات اور اثری انکشافات نے اب یہ حقیقت بے نقاب کر دی ہے کہ مہیب وعمیق سمندر کبھی فلک بوس پہاڑ تھے اور ہمالیہ کی یخ بستہ چوٹیاں بحر اطلانطک کی سی گہرائیاں تھیں۔ آبادی کی جگہ ویرانے اور ویرانوں کی جگہ آبادیاں تھیں۔ اور یہی سلسلہ غیر محسوس طور پر آج بھی جاری وساری ہے۔ لیکن ان انقلابات ارضی وسماوی کا انسان کی عمرانی زندگی پر کچھ ایسا گہرا اثر نہیں پڑتا، جیسا ان تغیرات کا جو زمین کی بجائے خود اہل زمین کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور جن سے سطح ارض کے نقشے بدلنے کی بجائے انسانی تہذیب وتمدن کے آثار بنتے اور بگڑتے ہیں۔ آج ایک قوم اپنی ترقی کی معراج کمال پر پہنچی ہے اور کل ہی آثار قدیمہ کے کھنڈرات اس کے اجڑے ہوئے کاشانوں اور لٹے ہوئے خزانوں کے مرثیہ خواں ہوجاتے ہیں۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ پھر مصیبت یہ ہوتی ہے کہ دور ہبوط میں سے گزرنے والی قوم اپنی دولت وثروت ہی نہیں کھو بیٹھتی بلکہ اسکی ذہنیت بھی کچھ ایسی پستی کے گڑھے میں جا پڑتی ہے کہ اسے اپنے ہاں کی ہر چیز معیوب نظر آتی ہے۔ اور روبہ ترقی اقوام کی ہر ادا محبوب۔ وہ سعادت ونجات کا راستہ ڈھونڈتی ہے تو انہی کے نقوش قدم میں اور اسکو فلاح وبہبود کی راہیں کھلتی نظر آتی ہیں تو انہی کی کورانہ تقلید میں غرض کہ وہ دیکھتی ہے تو انہی کی آنکھوں سے سنتی ہے تو انہی کے کانوں سے اور سمجھتی ہے تو انہی کے دلوں سے۔ اور اپنی یہ حالت ہوتی ہے کہ :۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا - وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا - وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا - أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷: ۲۲)

ان کے دل ہوتے ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں آنکھیں ہوتی ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں، کان ہوتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ وہ ڈھور ڈنگر کی طرح سے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ یہی لوگ غفلت شعار ہیں۔

یہی حالت آج امت مسلمہ کی ہے جس کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔

حضرات! زمانہ ترقی کر رہا ہے اور نہایت برق رفتاری کے ساتھ۔ زمانہ سے مراد آج اقوام یورپ ہی ہیں کہ وہ ترقی کی لامحدود فضاؤں میں بجلیوں کی سی سرعت کے ساتھ اڑتی چلی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پس ماندہ اقوام پر ان کی اس محیر العقول ترقی کا جتنا بھی مرعوب کن اثر ہو کم ہے، لیکن مسلمانوں کی ذہنیت پر اس کا خاص طور پر بڑا ہلاکت آفرین اثر پڑا ہے۔ اور اگر اس زہر کو، جو ملت اسلامیہ کی رگ و پے میں اس سرعت سے سرایت کرتا چلا جا رہا ہے، جلدی زائل نہ کیا جائے گا تو بعید نہیں کہ مسلمان اپنی ہستی کے جوہر خاص کو ہی کھو بیٹھیں۔ یورپ کو جب علمی ترقی کا خیال آیا تو مذہب ان کے راستے میں سب سے بڑا روڑا تھا۔ مسیحیت نے علمی ترقیوں کی کس قدر مخالفت کی، اس کا اندازہ لگانا مقصود ہو تو یورپ میں علم و کلیسا کی جنگ کی داستانیں پڑھیئے معلوم ہو جائے گا کہ جناب مسیح علیہ السلام کی معصوم بھیڑوں نے ہر جویائے علم و حقیقت کے ساتھ (جو غیر نہیں بلکہ یگانے تھے) کیسا درندگی کا سلوک کیا ہے۔ قتل و خون ریزی کی بڑی بڑی خونچکاں داستانیں اس کے سامنے شہرہ ہیں۔ گلیلیو Galileo کا کیا قصور تھا؟ یہی نا کہ اس نے کہہ دیا کہ میری آنکھیں مجھے دکھا رہی ہیں کہ زمین ساکن نہیں متحرک ہے۔ اور اس نے دوربین کے ذریعے کوپرنکیس Copernicus کے نظریہ کی تائید کر دی۔ رومن کلیسا اس کے خلاف جوش غیظ و غضب میں دیوانہ ہو گیا۔ مقدمہ چلایا گیا اور اس مجرم انکشاف حقیقت کے خلاف موت کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ جب اسے پیسا Pisa کے بلند مینار پر لے گئے کہ وہاں سے گرا کر اس ملحد کا خاتمہ کر دیا جائے تو ایک پادری بھی ساتھ گیا کہ مرنے والے سے گناہوں کے اعتراف کی آخری رسم ادا کرائی جائے۔ اس نے وہاں بھی جھک کر کہا کہ اگر اب بھی

کہدو کہ زمین ساکن ہے متحرک نہیں تو جان بخشی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس پرستار صداقت نے وہاں بھی کہدیا کہ ع

بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

"مجھے تو اب بھی زمین متحرک ہی نظر آتی ہے" چنانچہ پیسا کا مینار آج تک اس کے خون ناحق کا شاہد ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی خلاف محل نہ ہوگا کہ مسیحیت کو پرنیکس یا گلیلیو کے اس نظریہ کے خلاف کیوں تھی؟ فلکیات کے متعلق حکمت یونان میں ارسطو کا نظریہ نہایت معتبر سمجھا جاتا تھا جس کی رو سے زمین اس کائنات کی مرکز اور ساکن تصور کی گئی تھی اور جملہ اجرام سماوی اس کے گرد چکر لگاتے تھے۔ اگرچہ اس نظریہ کی فیثاغورث وغیرہ نے اسی زمانے میں تردید کر دی تھی لیکن ارسطو ہی کے نظریہ کو خاص اہمیت حاصل رہی اور یہی نظام بطلیموسی نظام فلکی کے نام سے یورپ میں رائج ہو گیا۔ مسیحیت کے اعتقاد میں جملہ کائنات میں اس زمین کو خاص اہمیت حاصل ہونی چاہیئے تھی جس پر خود خدا یا خدا کے بیٹے کی قربانی ہوئی۔ چونکہ بطلیموسی نظام کی رو سے زمین کو عالم موجودات میں ایک مرکزی اور خصوصی حیثیت حاصل تھی، اس لیے مسیحیت نے اس نظام کو اپنے اعتقادات میں داخل کر لیا۔ اس کے بعد جب علم و تحقیق کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ زمین بھی دیگر اجرام فلکی کی طرح متحرک ہے اور اسے کوئی خاص امتیازی شان حاصل نہیں تو اس سے چونکہ مسیحیت کے اولین اعتقاد پر زد پڑتی تھی، اس لیے کلیسا نے اسکی مخالفت کی۔ یورپ میں اس جدید نظام فلکی کو کوپرنیکس کا نظام کہتے ہیں۔ گلیلیو بیچارے نے چونکہ علی وجہ البصیرت اس جدید نظام کی تائید کر دی اس لیے حوالہ دار و رسن کر دیا گیا۔ علم و تحقیق کے خلاف یہ آتش جبر صرف قدامت پسند کلیسا کی طرف سے ہی نہ تھا بلکہ ان کے روشن خیال اور تجدد پسند طبقہ پراٹسٹنٹ نے بھی اس کے خلاف کافی زہر اگلا ہے جس کے متعلق خود لوتھر Luther اور میلانختون Melanchthon وغیرہ کی تصنیفات بھری پڑی ہیں۔

یورپ اگر ایسے مذہب کو چھوڑتا نہ تو اور کیا کرتا۔

ادھر ہندوستان میں جب علمی ترقی کا خیال پیدا ہوا تو وہی مظاہر فطرت۔ جن سے کروڑوں کام لینے تھے دیوی اور دیوتاؤں کی شکل میں سامنے موجود تھے۔ اندر۔ اگنی اور وائیو (یانی۔ آگ اور ہوا) جن کو تابع فرمان بنا کر

یورپ نے زمین و آسمان کو مسخر کر رکھا تھا ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت بجالانا پڑتا تھا جس آزادی پسند طبقہ نے علمی ترقیوں کو ضروری سمجھا وہ قدامت پسند طبقہ کے احتجاج کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے مستانہ وار آگے بڑھ گیا، اور یہاں بھی قدیم مذہب تیاگ دیا گیا۔

مسلمانوں نے جب دیکھا کہ دنیا میں جس قوم کو علمی ترقی کا خیال آتا ہے اسے سب سے پہلے مذہب کو چھوڑنا پڑتا ہے تو انھوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ "صاحب ہو نہ ہو ہمارے موجودہ نکبت و افلاس ہبوط و تنزل پس روی وتہی ماندگی کا واحد ذمہ دار ہمارا مذہب ہے۔ اور جب تک ہم اسلام کو نہیں چھوڑ دیتے دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتے"۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک حد تک اس مذہبی منافرت کے ذمہ دار وہ حضرات بھی ہیں جنھوں نے اسلام کا غلط مفہوم ان کے سامنے پیش کیا۔ لیکن اسلام کوئی ایسا مذہب تو نہیں کہ نہ اسکی اصلی تعلیم کے مآخذ مل سکتے ہوں اور نہ اسکی عملی تاریخ میسر آ سکے۔ انھیں چاہیئے تھا کہ یک طرفہ ڈگری صادر کر دینے سے پہلے اسلام کو موقع تو دیتے کہ اپنی صفائی پیش کر سکتا۔ کتاب و سنت کو اٹھا کر دیکھتے تاریخ امت کو ملاحظہ کرتے۔ اور پھر اس کے متعلق اپنی رائے قائم کرتے اور اس رائے کا اظہار بھی کرتے پھرتے۔ اگر اتنی تکلیف گوارا فرما لیتے تو یہ حقیقت ان پر واضح ہو جاتی کہ اور قوموں نے اگر مذہب کو چھوڑا ہے تو اس لیے کہ ان کا مذہب انکی علمی ترقیوں کے راستہ میں حائل ہو رہا تھا۔ برعکس اس کے ان کی علمی ترقیوں کا دور ہی وہ تھا جس میں مذہب اپنے اوج کمال پر تھا، اوروں کو اگر ترقی کرنے کے لیئے مذہب چھوڑنا پڑا ہے تو یہ ترقی کر ہی نہیں سکیں گے جب تک کہ حقیقی مذہب اسلام کو اپنا رہبر و ہادی نہیں بنائیں گے۔ یہ نہ تو محض ہماری خوش عقیدگی ہے اور نہ ہی صنمیات یونان کے افسانے۔ بلکہ یہ قرآن کریم کی صریح تعلیم ہے اور تاریخ کی ٹھوس حقیقتیں جو کچھ میں آج عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ سائنس کی ترقیوں کے اب اسلام کی تعلیم کیا ہے؟ اور جب ایک خدا پرست قوم نے اس تعلیم پر عمل کر کے دکھایا تو کیا کیا نتائج مرتب ہوئے۔ اور تاریخ کا یہ حصہ مسلمان نہیں بلکہ غیر مسلم مصنفین کی شہادات پر مبنی ہوگا کہ کسی جانبداری کا احتمال نہ ہو۔

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ انسان کو جس چیز نے "انسان" بنا دیا اور اسے اس قدر شرف و اعتبار بخشا ہے

وہ امتیازی خصوصیت کونسی ہے؟ قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں نہایت لطیف و حسین پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ "میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" فرشتوں کی معصوم نگاہوں نے جب اس پیکر کو دیکھا تو اس کے خمیر میں کچھ آتشیں اجزا بھی انھوں نے مضمر دیکھے۔ عرض کیا کہ بار الٰہا کیا دنیا میں ایسا نائب بنایا جائے گا جو وہاں فساد برپا کرے گا اور قتل و خونریزی کا مرتکب ہوگا؟ حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں،، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم بہتر جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے" لیکن اس کے ساتھ ہی اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری سمجھا کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر یہ پیکر خاکی خلافت و نیابت الٰہی کے قابل سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے" وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا،،۔ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی میں بلا تحدید و تعین تمام حقائق اشیاء کا علم ودیعت کر کے رکھ دیا۔ اور اسی فضیلت کی بنا پر اسے مسجود ملائک قرار دیا۔ لہٰذا یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ شرف و اجتبا جس کی بنا پر انسان خلیفہ فی الارض بنا علم حقائق اشیاء تھا۔ علم الاسماء سے محض الفاظ کی تعلیم مراد لینا درست نہیں۔ اس لیے کہ اول تو علم کہتے ہی ہیں ادراک معلومات کو جو غیر متبدل ہیں۔ برخلاف الفاظ کے جو ہمیشہ تغیر پذیر رہتے ہیں۔ پھر جو علم اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے مقابلے اور معارضے میں عطا فرمایا تھا وہ اس قدر ناقص نہیں ہو سکتا کہ محض اشیاء کے نام بتا دیئے ہوں۔ بلکہ اسماء سے مراد ہیں مسمیات چنانچہ مفسرین کا ایک کثیر گروہ اسی طرف گیا ہے جن میں امام رازی علیہ الرحمۃ بھی شامل ہیں۔ یہی وہ علم الاشیا ہے جس کے ایک حصہ کو یورپ علم الفطرت (Natural Science) سے تعبیر کرتا ہے اور اسے اپنے یہاں کی ایجاد بتاتا ہے حالانکہ اسلام نے صدیوں پیشتر اسے اصل انسانیت کا امتیاز قرار دیا ہے۔ پھر علم کی فضیلت کے متعلق قرآن کریم نے بیّن الفاظ میں فرما دیا کہ:۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ	کہو کہ جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے کیا
وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۳۹ : ۱)	دونوں برابر ہو سکتے ہیں،

چنانچہ تحصیل علم کی تحریک و تحریص کے طور پر نبی اکرم صلعم کی متعدد احادیث مروی ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ جو شخص

طالب علم کے لیے گھر سے نکلتا ہے اس کے ایک ایک قدم کے ساتھ دس دس نیکیاں شامل ہوتی ہیں"

کتاب وسنت کی ان تصریحات کے بعد اب ہمیں مسلمانوں کی علمی تاریخ کو دیکھنا ہے کہ وہ کس حد تک اس تعلیم کار بند ہوئی۔ اگرچہ علمی ترقیوں کی طرف رجحان تو بنی امیہ کے وقت سے ہی شروع ہو چکا تھا لیکن یہ ترقیاں اپنی معراج پر بغداد کی عباسی سلطنت اور اندلس کی اموی سلطنت میں پہنچیں اور قرطبہ و بغداد وہ مرکز تھے جہاں سے آفتاب علم و فضل افضلات عالم میں ضیا پاشی کرتا تھا۔ اس عہد کی علمی تاریخ پر بالاستیعاب نگاہ ڈالنے کے لیے بہت بڑی فرصت درکار ہے اس لیے اس مختصر سی صحبت میں مختلف علوم وفنون کی چند(۱) مثالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔ یہاں اتنا ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہر زمانہ کی ترقی کا موازنہ اُس زمانہ کی (حیثیت مجموعی) سے کرنا چاہیے۔ آج دنیا من حیث الکل بہت ترقی کر چکی ہے اور ترقی کا معیار بھی اتنا ہی بلند ہو چکا ہے۔ میں عہد اسلامیہ کی جس ترقی کا ذکر کر رہا ہوں یہ وہ زمانہ تھا جس میں ابھی یورپ کا بیشتر حصہ پتوں اور کھالوں سے ستر ڈھانپا کرتا تھا۔

سب سے پہلے علم الارض کو لیجیے:-

(۱) زمین کی پیمائش اور طبقات الارض کی تقسیم کا کام سب سے پہلے مسلمانوں نے شروع کیا۔ خلیفہ مامون الرشید نے شام کے علاقہ سے مساحت شروع کرائی۔ محمد ابن موسیٰ اس Survey Party کے انچارج تھے نیز اس نے ستر (۷۰) علماء (Scholars) کی مدد سے کرۂ ارض کا ایک نقشہ بنوایا۔ ان میں الخوارزمی بھی تھے جنہوں نے اپنی کتاب میں تمام روئے زمین کو سات مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے جس میں آج تک کوئی رد و بدل نہیں کیا جا سکا۔ اس سے قبل بطلیموسی جغرافیہ میں اس تقسیم کا کوئی وجود نہ تھا۔

(۲) مسعودی اس زمانہ کا جہاں گرد (Globe Trotter) تھا جس نے تمام آباد دنیا کا سفر پیدل کیا اور اپنے مشاہدات قلم بند کرتا چلا گیا۔

(۳) مشہور اندلسی حکیم ابوبکر نے تمام روئے زمین کی آبادی کے حالات متعدد ضخیم جلدوں میں لکھے ہیں۔

(۴) ادریسی بھی اس زمانہ کا مشہور جغرافیہ داں ہے جس کی علمی شہرت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ صقلیہ (سسلی) کے

عیسائی بادشاہ راجر دوم نے اسے اپنے دربار میں بلا لیا وہاں اس نے بادشاہ کے لیے ایک چاندی کا کرہ تیار کیا جس پر تمام دنیا کا نقشہ کندہ کرایا گیا تھا۔

(۵) اسی زمانہ میں حکیم ناصر خسرو۔ ابن بطوطہ اور ابن جبیر جیسے سیاح پیدا ہوئے جن کی علمی کاوشیں آج تک اہل علم و تحقیق کے لیے مایہ ناز ہیں۔

(۶) مقدسی نے جغرافیہ پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) لکھا جو تین حصوں پر مشتمل ہے ایک ذاتی مشاہدات۔ ایک ثقہ روایات اور تیسرا حصہ مطالعہ کتب پر مبنی ہے۔

(۷) الخوارزمی نے اس زمانہ میں جبکہ امریکہ کا خیال تک بھی کسی کو نہ تھا۔ ایک نظریہ ایجاد کیا جسے یورپ میں نظریہ Arim کہتے ہیں۔ جس کی رو سے اس نے ایک نئی دنیا کے وجود کے امکان کا پتہ دیا۔ مشہور فلاسفر بیکن نے اس نظریہ سے استفادہ حاصل کیا اور اسی کی روشنی میں کولمبس نے نئی دنیا کو دریافت کیا۔

(۲) جغرافیہ کے ساتھ ہی جہازرانی منسلک ہے۔

(۱) دسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے جہاز چین کے شہر کانفن تک جا پہنچے تھے اور وہاں سے کچھ مسلمان تاجر جاپان اور کوریا تک بھی گئے۔ ان علاقوں میں اسلام زیادہ تر انہی تجار کی بدولت پھیلا کیونکہ اس زمانہ میں تبلیغ کا کام کسی خاص طبقہ سے مختص نہیں کر دیا گیا تھا بلکہ ہر مسلمان کا پیشہ جداگانہ اور فریضہ تبلیغ ہوتا تھا۔

(۲) واسکوڈے گاما جس زمانہ میں افریقہ کا چکر کاٹ رہا تھا کہ اسے کسی طرح ہندوستان کا راستہ مل جائے تو جس شخص نے اس راہ گم کردہ منزل کو ٹھکانے لگایا وہ ایک عرب جہازران احمد ابن مجید تھا۔

(۳) نہر سویز کھودنے کا خیال حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ (عہد فاروقی) کے مجلہ دماغ کا رہین منت ہے۔

(۴) یورپ کی عام منڈیوں میں عرب تجار جس کثرت سے پھیل چکے تھے اس کا خفیف سا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ عربوں کی تجارتی اور جنسی اصطلاحات آج تک یورپ میں رائج ہیں۔ مثلاً Traffic وہی لفظ ہے جو عربوں کے یہاں تفریق (یعنی راستہ) تھا Tariff ان کے رسم الطریف سے نکلا ہے۔

(Magazine) عربوں کا مخزن (یعنی اسٹور) ہے۔ Cheque جس پر آج تمام کاروباری دنیا کا انحصار ہے۔ صک کا تفریخ ہے۔ اسی طرح Cotton ان کے یہاں کی قطن (کپاس) ہے۔ Orange وہاں کا نارنج Lemon لیموں اور Saffaron ان کے یہاں کا زعفران ہے۔ وقس علی ہذا۔ چنانچہ مشہور عیسائی جغرافیہ داں مسٹر سلطبرون لکھتا ہے کہ کولمبس سے پہلے عرب کی جماعتیں بحر اطلانطک میں مختلف مقامات اور زمینوں کی تلاش کرتی پھرتی تھیں۔

زمین کے بعد اہل زمین کے حالات یعنی علم تاریخ کو دیکھیے۔ امام طبری کی تاریخ بارہ مجلدات میں ہے۔ ابن خلدون کا مقدمۂ تاریخ۔ فن تاریخ میں (جسے Fronde نے تاریخ کی سائنس کہا ہے) آخری تصنیف سمجھی جاتی ہے اور جسے آج تک یورپ عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتا ہے۔ حاجی خلیفہ نے خاص عہد عباسیہ کی تاریخ میں قریب چودہ سو تصانیف شمار کی ہیں۔ مسعودی نے تاریخ کا انسائیکلوپیڈیا لکھا ہے جس طرح مقدسی نے جغرافیہ کا لکھا تھا۔

(۴) اب فلسفہ اور لٹریچر لیجیے جو ایک مہذب قوم کے نظام حیات میں بمنزلہ روح کے ہیں۔ الفریڈ گیلام مشہور مستشرق لکھتا ہے کہ یورپ میں جس قدر یونانی فلسفہ کی ترویج و اشاعت ہوئی، مسلمانوں کے تراجم کی رہین منت ہے۔ فارابی، ابن سینا، ابن رشد وغیرہم حکمائے اسلام نے یونانی فیلسوفوں کی تصانیف یورپ کے سامنے کھول کر رکھ دیں۔ حتیٰ کہ لاطینی زبان، جو یورپ کے جملہ علوم و فنون کی سرچشمہ سمجھی جاتی ہے اس میں بھی جس قدر فلسفہ منتقل ہوا سب اندلس کے مسلمانوں کی تصانیف کے راستہ سے آیا۔ شاہنشاہ الفانسو Alfonso The wise نے مشہور فلاسفر ابوبکر کو اپنے دربار میں دعوت دی کہ وہ یہودی اور عیسائی فلاسفہ کو درس دیا کریں۔ پروفیسر گب کا بیان ہے کہ جس طرح یورپ مذہب کے معاملہ میں یہودیت کا شرمندہ احسان ہے اسی طرح فلسفہ اور رومان کے مسئلہ میں عربوں کا زیر بار کرم ہے۔ قریب قریب یہی الفاظ ہسٹورینس ہسٹری اوف دی ورلڈ میں مسٹر ہنیڈ نے لکھے ہیں Lewes ہسٹری اوف فلاسفی میں لکھتا ہے کہ اگر ڈیکارٹ کے زمانہ میں احیاء العلوم (امام غزالی

کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہو گیا ہوتا تو لوگ ڈیکارٹ پر ادبی سرقہ کا الزام لگا دیتے۔

اب طب اور طبیعیات کو لیجیے۔ سر تھامس آرنلڈ کا بیان ہے کہ انکشافات طبیعی کے متعلق ابھی مسلمانوں کی تصانیف بہ تمام و کمال یورپ کے سامنے نہیں آئیں۔ ایک قسطنطنیہ ہی کی قریب قریب ستر لائبریریوں میں اس موضوع پر ایسی نادر تصانیف دھری رکھی ہیں جن سے یورپ آشنا نہیں ہوا۔ پھر یہ تصانیف کس کد و کاوش سے بہم پہونچائی گئیں اور کس تفحص و تجسس سے لکھی گئی تھیں اس کا اندازہ مامون الرشید کے عہد کے مشہور سائنسدان حنین بن اسحٰق کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے جالینوس کی ایک کتاب کی تصحیح کے لیے عراق، شام فلسطین اور مصر کا سفر کیا۔ اسی طرح فارابی نے ارسطو کی ایک کتاب پر تنقید لکھنے کے لیے اسے دو سو مرتبہ پڑھا۔

علم طب اور طبیعیات میں الکندی کی قریب ۶۵ تصانیف گنائی جاتی ہیں۔ جن میں اکثر جر ثقیل، مد و جزر، روشنی، آب و ہوا۔ فلکیات۔ معدنیات اور نباتیات پر ہیں۔

الرازی کی کتاب الحاوی ایک مدت تک یورپ کی طبی درسگاہوں میں داخل نصاب رہی ہے۔ الرازی نے سب سے پہلے چیچک کو متعدی مرض ثابت کیا۔ چنانچہ اس موضوع پر اس کا مقالہ یورپ میں عام مقبولیت حاصل کر چکا ہے

ابن سینا کے قانون کی شہرت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ تیس برس کے عرصہ میں ایک لاطینی زبان میں اس کے پندرہ ایڈیشن چھپ گئے تھے۔ ابن سینا نے پہاڑوں کی تخلیق۔ جمادیات کی تحقیق۔ زلزلوں کے اسباب۔ حصول آلات۔ ٹمپریچر (مقیاس الحرارت) اور دیگر عناصر طبیعی کے خواص پر بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں جو یورپ کے سامنے موجود ہیں

اخوان الصفا نے جو دسویں صدی میں ایک خفیہ انجمن تحقیقات علمی کے لیے قائم ہوئی تھی، ایک سائنس کا انسائیکلوپیڈیا لکھا ہے جو ۲۰ مقالات پر مشتمل ہے اور جن میں سے ۷ مقالات علم الفطرت Natural Science کے متعلق ہیں۔

ابن خطیب اندلسی نے طاعون کے اسباب دریافت کیے اور تغذیہ کے لیے حفظ ماتقدم کے اصول متعین کیے۔

ابن زہر اندلسی کی کتاب التیسیر۔ خواص الادویہ اور طریق علاج میں لاطینی میں سند مانی جاتی ہے

اسی طرح زہراوی اندلسی کی جراحت پر کتاب علم تشریح الابدان کی بنیادی تصانیف میں سے ہے۔

عملی میکانکس (علم الحیل) کے متعلق حکیم خرقی نے تیرھویں صدی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا اور ڈاکٹر لیبان نے لکھا ہے کہ عربوں نے عملی میکانکس کے آلات ایجاد کر کے یورپ کو ان کا استعمال سکھایا۔ کاغذ آٹھویں صدی میں اسلامی ممالک میں رائج ہو چکا تھا۔ پانی کی گھڑیاں خلفائے عباسیہ کے وقت استعمال میں آتی تھیں۔ چنانچہ ہارون الرشید نے ایک عجیب وغریب گھڑی تحفتہً شاہ شارلیمین کو بھیجی تھی۔

مشہور مورخ گبن لکھتا ہے کہ الکیمیا (Chemistry) اپنی اصل کے اعتبار سے عربوں کی ایجاد ہے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے آتشین مرکبات ایجاد کیے۔ تیزاب مثل نائٹرک ایسڈ ہائیڈرو کلورک ایسڈ پوٹاس، امونیا، کلورائیڈ اوف مرکری۔ وغیرہ کیمیاوی مادے نکالے۔ زہروں کو دواؤں میں تبدیل کیا۔ اور (Gasses) کی خصوصیات دریافت کیں (ملاحظہ ہو Intellectual Development of Europe)

اب فلکیات کو دیکھیے۔ خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں بغداد کے شمسیہ دروازے کے باہر ایک عظیم الشان رصدگاہ (Observatory) قائم ہو چکی تھی جہاں اجرام سماوی کی گردش کے متعلق تحقیقات بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ یحییٰ بن منصور اس رصدگاہ کے انچارج تھے۔ ان کی کتاب الاعمال، علم ہیئت پر ایک مستند تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ یورپ کل تک بھی بطلیموسی نظام کا قائل تھا۔ جس کی رو سے زمین ساکن بتائی جاتی تھی۔ لیکن فارابی نے بہت عرصہ پیشتر اس نظریہ کی سوفیانہ توجیہات کی دھجیاں اڑائیں، اور اس کی جگہ اس نظام فلکی کی بنا ڈالی جو یورپ میں کوپرنیکس کے نظام کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس پر آج یورپ کی تمام فلکی تحقیقات کی بنیاد قائم ہے۔

علاوہ بریں مختلف علوم وفنون کے متعلق مسٹر ڈی۔ ایل۔ وسوالی۔ ایم۔ اے لکھتے ہیں کہ یورپ جس زمانہ میں جہالت کی عمیق گہرائیوں میں پڑا ہوا تھا اسپین کے حکماء اسلام سائنس اور ادب کی شمعیں لے کر آگے بڑھے اور یورپ کو طب، ریاضی، فلسفہ۔ اور دیگر علوم پر درس دینے لگے۔ وہ لوگ جہازوں کی ساخت۔ باغوں کی پرورش۔ پھولوں کے تحفظ۔ لوہے اور پیتل کے ظروف۔ سوتی اور ریشم کے کپڑے۔ طباعت و مرصع کاری وغیرہ صنعتوں میں بھی بہت ماہر تھے۔

لیکن یہ سب علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات ان علماء اسلام کی ذہنی افتاد یا طبعی رجحان کا نتیجہ نہ تھی بلکہ ایک خاص جذبہ تھا جس کے ماتحت یہ امور سر انجام پاتے تھے۔ وہ جذبہ کیا تھا؟ وہ کونسی قوت تھی جو انھیں ان علمی کاوشوں پر آمادہ کردیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ مخصوص جذبہ، وہ قوت محرکہ ان کے مذہب کی تعلیم تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب مسلمانوں کے نظام حیات میں ہمیشہ بمنزلہ دماغ کے رہا ہے۔ جب تک دماغ رو بہ صلاح اور قوی ہوتا ہے تمام اعضاء و جوارح اپنی اپنی جگہ بحسن و خوبی کام کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب اس سرچشمہ قوت و صلاح میں کمزوری پیدا ہوجاتی ہے تو اعضاء و جوارح اگرچہ بظاہر صحیح و سالم نظر آتے ہیں لیکن ان کی قوت عمل سلب ہوجاتی ہے۔ اس زمانہ میں چونکہ حرارت دینی نظام حیات میں موجود تھی اس لیے ہر شعبہ زندگی اپنی اپنی جگہ نشوو ارتقاء کے منازل طے کرتا چلا جاتا تھا۔ یہی مذہبی ولولہ اور جوش ہی تھا کہ وہ اتنی مصیبتیں جھیلتے تھے۔ مگر علمی تحقیقات میں ان کا قدم پیچھے نہ ہٹتا تھا۔ اس لیے کہ وہ اسے بھی ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ پھر وہ زمانہ کچھ آج کا نہ تھا کہ علمی ریسرچ کے لیے اس قدر آسانیاں موجود ہوں۔ آج کسی سرکار کے دل میں کسی علمی تحقیق کا خیال پیدا ہو۔ فوراً بڑی بڑی سوسائٹیاں اسکی مدد کے لیے تیار ہوجاتی ہیں۔ فنڈ جمع کیے جاتے ہیں۔ رفقائے کار سربکف پابہ رکاب ہوتے ہیں۔ وہ اگر افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اپنا کیمپ نصب کریں تب بھی ہالینڈ کا مکھن لندن کے بسکٹ، کشمیر کے سیب اور کینیڈا کی روٹی۔ غرض سب کچھ وہیں ان کو پہونچتا رہتا ہے لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ فن حدیث کے امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ جب میں تحصیل علم کے لیے گھر سے نکلا تو والدہ نے دو سو کلچے چادر میں باندھ دیئے تھے معمول یہ تھا کہ ہر روز ایک کلچہ وضو کے پانی میں بھگو کر کھا لیتا۔ چنانچہ جب یہ کلچے ختم ہوگئے تو دار العلوم کو بادل ناخواستہ چھوڑنا پڑا۔ اور جب تک پھر روٹی کا انتظام نہ ہوا تحصیل علم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ابن حاتم رازی نے لکھا ہے کہ انھوں نے تحصیل علم کے لیے نو ہزار میل کا پیادہ سفر کیا۔ حضرت امام مالک رح فرماتے ہیں کہ ایک ایک حدیث کی تحقیق کے لیے اکثر اوقات چالیس چالیس دن کا سفر کرنا پڑا۔ ضیاء الدین ابن عاصم نے خاص نباتات کی تحقیق کے لیے روم، یونان، اور اسپین کے ممالک کا سفر کیا اور اکثر ان حالات میں کہ نہ کھانے کو روٹی ملتی نہ سونے کو چھت میسر آتی۔

غرضکہ حالت یہ تھی کہ پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے ہیں۔ پنڈلیاں گرد وغبار سے اٹی رہی ہیں۔ لباس چیتھڑے ہو رہا ہے چہرے پر ضعف ونقاہت سے مردنی چھا رہی ہے۔ لیکن سر میں ایک ولولہ ہے کہ ان کے پائے استقلال میں جنبش نہیں پیدا ہونے دیتا۔ اور ان کی یہ ہیئت کذائی زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ ؎

بے دست وپائیم کہ ہنوز از دو فور عشق

سود است وسرم کہ بسامان برابر است

تہذیب اخلاق و تزکیۂ نفس ہو یا تدبیر ملک و تنظیم جیش، علوم وفنون کی تحقیق ہو یا تمدن و تہذیب کی کاوش سب منزلیں اسی جوشش مذہبی کے جذبہ میں طے ہو جاتیں۔ ان کے نزدیک ؎

ولایت، پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری

یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اس لیے کہ قرآن کریم گوناگوں طریقوں سے تدبر و تفکر کی تاکید کر رہا ہے کہیں حکم ہے۔ کہیں ترغیب و ترہیب کہیں عدم تفکر پر مذمت۔ وہ لوگ اس کتاب کو ہماری طرح محض ثواب کی غرض سے نہ پڑھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک یہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل دستور و ضابطہ تھا اور منازل حیات کے ایک ایک قدم پر وہ اس سے استشارہ کرتے تھے۔ ہم میں سے کون ہے جس نے اس آیت کو نہیں پڑھا:۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۴۰: ۹)	کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے گزر چکی ہیں ان کا کیا انجام ہوا؟

ہم اس آیت مقدسہ کو پڑھتے ہیں اور پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن وہ دور عمل تھا جس کے متعلق حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا:۔

"ہم میں سے جب کوئی قرآن کی دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو جب تک انکی حقیقت سے آگاہ نہ ہو جاتا۔ اور ان پر عمل نہ کر لیتا۔ آگے نہ بڑھتا"۔ (تفسیر ابن جریر)

انھوں نے اس آیت کے رموز و معارف پر غور کیا۔ سیروا فی الارض سے سیاحت کا نکتہ پایا اور اس سیاحت اور لنظارۂ ارضی سے علم جغرافیہ کی بنا پڑی۔ اقوام گزشتہ کے انجام و عواقب پر نگاہ ڈالی تو علم تاریخ مرتب ہوگیا۔ ان کے اجڑے ہوئے کاشانوں کو چشم عبرت سے دیکھا تو آثار قدیمہ کا علم وجود میں آگیا۔ غرضیکہ ایک ہی آیت قرآنی پر تدبر و تفکر اور عمل سے علم کے تین مختلف شعبوں کا نظام عمل میں آیا۔

انھوں نے اس آیت کو دیکھا :۔

أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۔ (۱۶: ۱۱)	کیا انھوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ جو سما میں مسخر کئے گئے ہیں۔ اور ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں سنبھالتا۔ اس میں ایمان والوں کے لیئے نشانیاں ہیں۔

اس میں غور کیا کہ ایمان والوں کے لیے جو اس میں نشانیاں بتائی گئی ہیں۔ وہ کیا ہیں۔ اب ایمان کا تقاضا تھا کہ وہ اسکی کنہ و حقیقت تک پہنچتے۔ انھوں نے کوشش کی اور جر ثقیل ۔ مرکز ثقل کشش ارضی کے نظریے دریافت کیے۔ چنانچہ پروفیسر Deitrici نے جو لکھا ہے کہ "نیوٹن کے نظریہ کشش ثقل کے آثار مسلمانوں کی تصانیف میں ملتے ہیں"، تو وہ انھی آیات پر تدبر کا نتیجہ تھا۔ اور یہی وہ نظریے ہیں جن کی ارتقائی شکل آج طیاروں (ہوائی جہازوں) کی صورت میں آپکے سامنے ہے۔

انھوں نے رتق و فتق کی آیت پر غور کیا تو یہ حقیقت ان کے سامنے بے نقاب ہوگئی کہ آسمانی کرے تمام کرے آغاز پیدائش میں ایک ہیولے سے مرکب تھے۔ پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر الگ الگ کرے بن گئے :۔

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (۲۱: ۳۰)	کیا ان لوگوں نے جو آیات الہی کا انکار کرتے ہیں یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین پہلے آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو الگ الگ کر دیا۔ اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا۔ کیا پھر بھی یہ ایمان نہیں لاتے ؟

آیت کے آخری ٹکڑے سے انکی توجہ اس طرف بھی گئی کہ تمام ذی حیات اشیاء کا تولد اولین پانی سے ہوا کیا نون وفنق اور پانی کا مبدا رحیات ہونا۔ آج سائنس کے آخری انکشافات نہیں ہیں۔ نظریہ ارتقا۔ Evolution Theory آج سائنس کی تحقیقات کا معرکۃ الآرا کارنامہ سمجھا جاتا ہے لیکن اہل علم حضرات سے پوشیدہ نہیں کہ اسکی ابتدا بھی مسلم ائمۂ علم و حکمت کی ذہنی کاوشوں کی رہین کرم ہے۔ فارابی۔ ابن سینا ابن مسکویہ اور ابن باجہ نے اپنی تصانیف میں اس نظریے پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ یورپ کے ارتقائیوں نے ابتداء میں ضرور ان حکماء اسلام کے اشارات سے استفادہ حاصل کیا ہو گا مگر فرق یہ ہے کہ حکمائے اسلام کے نظریے کے مطابق تمام سلسلۂ نشو و ارتقا مشیت و ارادۂ باری تعالےٰ کے ماتحت عمل میں آتا ہے اور مغربی سائنسدانوں کی تعلیم کی رو سے خدا کی ہستی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی یہی اساسی فرق ہے اسلام اور مغربی سائنس میں۔

انھوں نے تکویر لیل و نہار۔ اور تسخیر شمس و قمر پر غور کیا تو فلکیات کے راز ان پر منکشف ہو گئے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی۔

(۱۱:۳۹)

اس نے زمین و آسمان کو حکمت سے پیدا کیا۔ وہ رات (کی تاریکی) پر دن (کی روشنی) اور دن (کی روشنی) پر رات (کی تاریکی) چادر لپیٹ دیتا ہے۔ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک ایک وقت معین تک چلے جا رہا ہے۔

جس نظام شمسی کی بنیاد انھوں نے قرآن کریم کی ان آیات کی روشنی میں قائم کی وہ آج سائنس کی تحقیقات کی آخری سعد ہے۔ چنانچہ کُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (ہر ایک کرہ اپنے اپنے دائرہ میں تیرتا پھرتا ہے) نے بطلیموسی نظام کی تغلیط کر کے علم ہیئت کی صحیح منزل کی طرف فارابی کی رہنمائی کی۔ "کل فی فلک" میں ایک لفظی و معنوی صنعت بھی ہے۔ یعنی اس کو اگر الٹ کر بھی پڑھیے پھر بھی "کل فی فلک" ہی ہوتا ہے۔ [illegible] اور پھر باقی نصف دائرہ الٹنے سے۔ گویا اس طرح سے ایک پورا دائرہ بن جاتا ہے (لطیفۂ شان قرآن) غیرہ تو

ایک ضمنی بات تھی۔ فلکیات کے متعلق ہرشل نے اپنی مدت العمر کے تجارب کے بعد جس نظریے کا اضافہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ سورج مع اپنے نظام کے ایک اور ستارے کی طرف دوڑ رہا ہے جو اس کا مستقر ہے۔ اس ستارے کو ویگو کہتے ہیں، لیکن ہرشل سے تیرہ سو سال پیشتر قرآن کریم کی اس آیت نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا:۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۔ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۔ (۳۶ : ۳)

اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ اندازہ باندھا ہوا ہے اُس خدا کا جو زبردست علم والا ہے۔

غرض کہ ان اہل نظر مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی ہر چیز میں ایک آیت الٰہی - ایک خداوندی نشان - ایک راز فطرت مضمر ہوتا تھا۔ وہ ہر ایک چیز کو تجسس کی نگاہ سے دیکھتے اور نقاب برافگندہ عروس حقیقت کو علمی تحقیقات اور عملی تجارب سے جنت نگاہ بنا لیتے۔ صبح کی سپیدی میں، رات کی سیاہی میں، شفق کی رنگینی میں، قوس قزح کی بہجت آفرینی میں، پہاڑوں کی بلندیوں میں، سمندروں کی گہرائیوں میں۔ بادلوں کی روانیوں میں، نسیم سحر کی عنبر فشانیوں میں، سورج کے جلال میں، چاند کے جمال میں، انھیں صحیفہ فطرت کے اوراق کھلے ہوئے ملتے۔ جو انھیں دعوت علم و عمل دیتے، کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۔ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ ۔ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۔ وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ ۔ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۔

(۲ : ۲۰)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں۔ اور رات اور دن کے آنے جانے میں۔ اور جہازوں میں جو کہ لوگوں کے فائدہ کی چیزیں سمندروں میں لے کر چلتے ہیں۔ اور (بارش کے) پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو پژمردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی، اور اس میں ہر قسم کے حیوانات پھیلا دیے، اور ہواؤں کے (رخ) بدلنے میں، اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان (معیدا معلق) رہتی ہیں سمجھ رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

ایک مسلمان کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ ان آیات اللہ پر ایک محکم یقین رکھے وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ قرآن کریم کی ان شہادات کو دنیا کے سامنے سچا ثابت کر دے۔ اور یہ اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ فطرت کے ایک ایک نقش و نگار کو دیکھے اور پیہم تجربات اور مسلسل مشاہدات سے ان کی حقیقتیں دنیا کے سامنے کھول کر رکھے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے نزدیک تو مومن کی صفت ہی یہی ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اس صانع حقیقی کی صنعتوں پر غور کرے اور اسکی نگاہ وقیقہ رس، پھول اور کانٹے کے نظر فریب امتیازات سے گزر کر شاخ گل کی ان گہرائیوں تک جا پہنچے جہاں ایک ہی قسم کے قوام سے پھول کو مشام جانفزا اور کانٹے کو نوک خلش زا عطا ہوتی ہے۔ وہ چل رہا ہو تو گل و بوٹے کی شادابی و شگفتگی اسے دعوت نظارہ دے، بیٹھے تو ریت کے ایک ایک ذرے میں ہزاروں آفتاب درخشاں نظر آئیں اور لیٹے تو آسمان کی جڑاؤ چھت ایک مرصع کار کی تحسین و تزئین کی داد مانگ رہی ہو۔ غرضکہ نہ اس کا اٹھنا بیکار ہو اور نہ اس کا بیٹھنا خالی از مصلحت ؎

بیٹھے تو عجز نقش کف پا لیے ہوئے اٹھے تو درد دل کا بہانہ لیے ہوئے

اس لیے کہ اس کے خضر راہ کا اشارہ ہے کہ:۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳: ۲)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں، اور رات اور دن کے آنے جانے میں، اہل عقل کے لیے نشانیاں ہیں وہ لوگ جن کی یہ حالت ہے کہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار تو نے اس (موجودات) کو لایعنی پیدا نہیں کیا۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کا دعویٰ ہم اسی وقت کر سکتے ہیں جبکہ فی الحقیقت ہم دنیا کی ہر ایک چیز کو سود مند کر دکھائیں۔ اور یہ "علم حقایق اشیاء اور علم منافع اشیاء" کے بغیر کیسے ممکن ہے؟

برادران! سائنس کا سب سے بڑا احسان یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ہر ایک چیز کی کنہ حقیقت کو آشکارا کر کے دنیا میں عجائب پسندی اور توہم پرستی کے امکانات کو کم کر دیا ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ لیکن دیکھئے تو سہی کہ توہم پرستی کا استیصال سب سے پہلے اسلام نے کیا ہے یا موجودہ سائنس کے انکشافات نے۔ مذاہب کی دنیا میں یہ شرف صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے ہر ایک دعوے کی بنیاد دلیل و برہان پر رکھی ہے۔ دین اور عقل میں شروع سے ایک جنگ چلی آتی تھی لیکن اسلام نے اپنی بصیرت افروز تعلیم سے دین اور عقل کو ایک کر دکھایا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ :-

أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ ۚ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (اے رسول فرما دیجئے کہ) میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور جس نے میری پیروی کی وہ بصیرت کی بنا پر اس راستہ پر چل رہا ہے (۱۲:۱۰۸)

"اسلام اور عقل" ایک مستقل عنوان ہے جس کے متعلق ضمناً شرح و بسط سے کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کسی اور فرصت میں گزارش کروں گا۔ البتہ اس وقت توہم پرستی کے متعلق ایک واقعہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ نبی اکرمؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ کا انتقال ہوا تو اس دن سورج گہن لگ گیا۔ عرب کا سا توہم پرست ملک، لوگ فوراً حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضورؐ کی صداقت کا کتنا زبردست ثبوت ہے کہ آپ کے غم میں اجرام فلکی نے بھی ماتمی لباس پہن لیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "بجا نہیں۔ چاند اور سورج کا گہن تو اپنی قدرت کے مطابق عمل میں آتا ہے۔ اس کا کسی کی موت یا پیدائش سے کچھ تعلق نہیں"، کیا توہم پرستی کی جڑ پر اس سے بھی زیادہ شدید کوئی ضرب لگائی جا سکتی ہے؟ اور یہ اس "روشنی" کے زمانہ سے تیرہ سو برس پیشتر کا واقعہ ہے۔

حضرات! اس دھندلے سے خاکے سے آپ کو کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسلام علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیوں کا کس درجہ حامی و مؤید ہے اور مذہب اسلام کے دور عروج میں سائنس کی ترقیاں کس بلندی پر پہنچ گئی تھیں۔ پھر یورپ کے محققین اور حکمائے اسلام میں ایک بہت بڑا اصولی فرق بھی ہے۔ یورپ اپنے محققین کے صرف علمی کارنامے پیش کرتا ہے ان کے ذاتی کیرکٹر سے کسی کو کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اسلام سب سے پہلے کیرکٹر کو پرکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان اور تقوے کی فضیلت سب سے مقدم ہے۔ یورپ میں بیکن کو

علمی تحقیقات میں جو مرتبہ حاصل ہے ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں - لیکن اسی بیکن کی اخلاقی لغزشوں کی یہ حالت ہے کہ پوپ اس کے متعلق لکھتا ہے کہ :-

"نوع انسانی کا شریف ترین اور ذلیل ترین فرد"

لیکن مسلمانوں میں اگر امام غزالی - ابن تیمیہ - ابن مسکویہ وغیرہم کا نام جو آج تک سلام و حرمت سے لیا جاتا ہے تو محض اس لیے کہ علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی بلندیوں کی مثال بھی کم ہی نظر آئے گی - پھر انفرادیت کو چھوڑ کر اگر اجتماعی حالت پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اقوام مغرب اگر سائنس کے ایجادات میں اس درجہ منہمک ہیں تو محض اس لیے کہ ایک قوم کی قوت قاہرہ دوسری قوم سے کم نہ ہو جائے اور .... میدان حرب میں سائنس کی کرشمہ سازیاں اقوام مقابل کو بالادست نہ کر دیں - یہ حقیقت ہے کہ سائنس کی ترقیاں گزشتہ جنگ عظیم کے بعد سے جو اس قدر برق رفتار ہوئی ہیں اسکی وجہ ہی یہی ہے کہ اقوام عالم میں باہمی اعتماد اٹھ چکا ہے، اور ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے اور اسی لیے سائنس کی ایجادات میں ایک دوسرے پر مسابقت کی فکر دامنگیر ہے ظاہر ہے کہ جس علمی اور عملی انہماک کا محرک یہ جذبہ ہو اس سے اہل عالم کے امن و سکون اور اطمینان قلبی میں کس قدر اضافہ ہو گا ؟ برعکس اس کے مسلمانوں کی علمی ترقیوں کا مطمح نظر کیا تھا اور خدا کی زمین پر بسنے والوں پر انکا کیا اثر پڑا ؟ اس کے متعلق اگر ہم کچھ کہیں گے تو شاید جانبداری پر محمول کیا جائے گا - اس لیے ایک غیر مسلم کی رائے اس باب میں زیادہ موثق سمجھی جائے گی - ہندوستان کی علمی دنیا کی مایہ ناز ہستی مسز سروجنی نیڈو نے فرمایا ہے :-

"عرب فوجیں یلغار کرتی ہوئی فرانس کے دروازے پر پہنچی تھیں تو کیوں ؟ فتح و ظفر و دولت کے لیے نہیں - ملک گیری اسلام کا اصل مقصد نہ تھا اس کا مقصد حریت و آزادی کی اشاعت عمومی اور غلامی کا استیصال تھا - آج کل ہم ملکی طاقت کے لیے مرتے ہیں - اور علاقوں کا رونا روتے ہیں - مگر اسلام کا مطمح نظر کوئی ملک یا صوبہ یا خطہ نہ تھا بلکہ اس کا مقصد ساری دنیا کی نجات تھا - اور مسلم داعی اسی دھن سے کہ ملکوں ملکوں مارے مارے پھرتے تھے - عرب

> نے صرف ملک کی زمینیں فتح نہیں کیں بلکہ دل اور دماغ فتح کیے۔ انھوں نے قدیم لٹریچر اور خیالات کو متاثر کیا۔ ہمارے (اہل ہنود کے) اوہام و خیال کو حقیقت کا جامہ مسلمانوں نے پہنایا۔ ہمارے افکار و تخیلات میں حرکت اور جان انھوں نے ڈالی مسلمانوں نے دنیا میں علوم و فنون کی بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ اخلاق۔ فیاضی۔ اولوالعزمی ہمیشہ انکی قومی خصوصیات رہی ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں کی طرح اشاعت علوم میں کبھی بخل نہیں کیا۔ یہ ہمیشہ بنی نوع انسان کی تعلیم و تربیت کی فکر میں رہے ہیں،،
>
> (بحوالہ کیپٹل مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۱۸ء)

برادران! میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا۔ ہمارے ہاں ایک تجدد پسند، روشن خیال، طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے نزدیک کسی شے کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار محض حکماء یورپ کی رائے ہے۔ حتیٰ کہ وہ قرآن کریم کے حقائق و معارف بلکہ اوامر و نواہی تک کو بھی اسی کسوٹی کے ذریعے سے پرکھتے ہیں۔ اگر قرآن حکیم کا کوئی ارشاد کسی یورپین محقق کے قول یا نظریہ سے مطابقت پا جاتا ہے تو وہ اسے قرآن حکیم کی صداقت کا ایک زندہ معجزہ سمجھ کر ساری دنیا میں اسے لیے پھرتے ہیں۔ اور اگر ذاتی تعلیم اور یورپ کے دماغ میں کہیں تضاد و تخالف واقع ہوتا ہے تو ان کی انتہائی کوشش اس میں صرف ہو جاتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر۔ موڑ توڑ کر۔ قرآن کو یورپ کی ذہنی افتاد کے مطابق ثابت کر دیا جائے اور پھر اس "جہاد عظیم" کی دھن میں وہ قرآنی آیات کی ایسی مضحکہ خیز تاویلیں کرتے ہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں کی ہنسی بھی تھامے نہ تھم سکے۔ یہ مرعوب ذہنیت کی خود فریبی اور اصول قرآن فہمی کی بنیادی غلطی ہے۔ اس چیز کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات، خواہ کسی ملک میں ہوں، یا کسی زمانہ میں، جب بھی وہ یقینیات کے درجہ کو پہونچ جائیں گے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ارشادات قرآنی کے خلاف ہو سکیں۔ اس لیے کہ سائنس کے انکشافات بالآخر ہیں کیا؟ یہی نا کہ فطرت کی چھپی ہوئی حقیقتوں پر سے پردہ اٹھا دیا جائے۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ فطرت کی

کوئی حقیقت بے نقاب ہو اور وہ صحیفۂ فطرت کے مصنف حقیقی کے کسی ارشاد کے خلاف نکلے ؟

"این خیال است و محال است و جنون"

لیکن علمی تحقیقات کی یہ حالت ہے کہ ایک نظریہ کو یقین کے درجہ تک پہنچنے کے لیے ہزاروں قیاسات کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی تو ایک موجد کی زندگی میں ہی اس کا قیاس غلط ثابت ہو جاتا ہے اور کبھی آنے والی نسلیں اسکی دھجیاں بکھیر دیتی ہیں۔ لہذا جو نظریہ آج قرآن کریم کے کسی ارشاد سے مطابقت نہیں پاتا اسکی کیا دلیل ہے کہ وہ نظریہ محکم اور یقینی ہے۔ قیاسی اور ظنی نہیں؟ مشاہدات اور قیاسات میں ایک بین فرق ہے جسے کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن کریم کا کوئی اشارہ بھی آج تک کسی مشاہدہ کے خلاف ثابت نہیں ہو سکا لیکن اسکی تعلیم کو قیاسات کے مطابق ثابت کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ یہی غلطی ہم اس سے پہلے بھی ایک دفعہ کر چکے ہیں جبکہ علمائے اسلام نے قرآن حکیم کو فلسفہ یونان کے مطابق ثابت کرنے میں اس قدر دماغ سوزی سے کام لیا۔ حالانکہ فلسفہ کے اصول ہمیشہ قیاسات پر مبنی ہوتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ آج اس فلسفہ قدیم کی بنیادیں منہدم ہونے کے ساتھ ہی ان علماء کی تمام کاوشیں بھی اکارت گئیں۔ نہیں بلکہ جن لوگوں نے قرآن کریم کو انھی علماء کی وساطت سے سمجھا تھا اور ان کی توضیحات کو اصل قرآن خیال کرتے تھے، ان کے دلوں میں خود قرآن کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات سے ارتیابی کیفیتیں پیدا ہو گئیں۔ ان آیات قرآنی کو جن کی تصدیق کسی زمانہ کے قیاسی نظریوں سے نہ ہو سکے، متشابہات کے تحت رکھنا چاہیے اور ان کے متعلق یہ ایمان ہونا چاہیے کہ ان کی حقیقتیں بلا شک و شبہ صحیح اور درست ہیں اور زمانہ کی ترقی سے ایک وقت آئے گا کہ متشابہات کی تصدیق کر کے انھیں محکمات کے زمرے میں داخل کر دیں گے۔

آخر میں ایک مختصر سی گزارش حضرات علماء کی خدمت میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے لیکن چونکہ بات قرآن کی ہے اس لیے اس کے عرض کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ قرآن کریم نے جو علم کی اس درجہ تاکید فرمائی ہے اس علم کی تعریف کیا ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے :-

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷: ۳۶)

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت چلو (یاد رکھو) کان - آنکھ اور دل - ان سب سے باز پرس ہوگی۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک علم وہ ہے جس کی شہادت سمع - بصر اور قلب سلیم دیں اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ظن اور قیاس ہے - علم کے یقینی مرتبہ تک نہیں پہونچتا (مجھے یاد پڑتا ہے کہ صاحب تذکرہ نے بھی غالباً اس آیت سے کچھ ایسا ہی استدلال کیا ہے - یہ بات میں نے کچھ بطور سند کے پیش نہیں کی بلکہ توارد کے طور پر کہدی ہے) - ہمارے مذہبی مکاتب میں جو نصاب تعلیم مقرر ہے اس میں غور فرمایئے کہ کتنا حصہ ظن وقیاس کا ہے اور کس قدر علم ویقین کا - فلسفہ یونان منطق علم الکلام (جسے فی الحقیقت فلسفہ یونان کی ہی ایک شاخ کہنا چاہیئے) تمام ظنی اور قیاسی ہیں - وہ بھی ایسی کہ خود موجودہ ظنیات میں بھی انھیں کوئی نہیں قبول کرتا - یورپ ایک عرصہ تک انہی قیاسات کی نکتہ آفرینیوں میں الجھا رہا - مسئلہ پیش ہوجاتا کہ "مرغی کے منہ میں دانت ہو سکتے ہیں یا نہیں" اب فلاسفرز کی ایک جماعت اثبات کی طرف اور ایک نفی کی طرف ہو جاتی ہے - دلائل پر دلائل لائے جاتے ہیں - منطقی توجیہات پیش کی جاتی ہیں صغریٰ اور کبریٰ ملائے جاتے ہیں - لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ مرغی کا منہ کھول کر دیکھ لو کہ اس میں دانت ہیں یا نہیں - حتیٰ کہ بیکن ان میں پیدا ہوا - اس نے سب سے پہلے یورپ میں علم کی وہ تعریف کی جو قرآن کریم کی مصرحہ صدر آیت میں تیرہ سو سال پیشتر دنیا کے سامنے آچکی تھی اور اس نے مرغی کا منہ کھول کر دکھا دیا - آپ حیران ہونگے کہ علم کی اس تعریف بدل جانے سے اس قوم کی ذہنیت بدل گئی - اور آج جس قدر علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیاں ہو رہی ہیں سب علم کی اسی تعریف پر مبنی ہیں - لیکن ایک ہم ہیں کہ :-

ہوئی لاکھ دنیا ادھر کی اُدھر ہے
وہی سنگ در ہے وہی اپنا سر ہے

ضرورت ہے کہ ہم بھی اپنے زاویۂ نگاہ کو قرآن کریم کی روشنی میں بدلیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے "علم دین" کہا جاتا ہے اس سے مقصد یہی ہے کہ ہم زندگی کے مراحل میں اسے شمع ہدایت بنا سکیں اور اسکی روشنی میں منزل مقصود تک پہنچیں لیکن اگر اس شمع کو ہم اپنی کوٹھڑیوں کی زینت بنا کر بیٹھ جائیں تو ہر چند شمع کے نورانی ہونے میں شبہ نہ ہوگا، لیکن منزل مقصود تک تو ہم نہیں پہونچ سکتے۔ وہاں تو وہی پہونچیگا جو مسافت قطع کر رہا ہوگا۔ اور علم دین امور دنیا ہی میں اسی صورت میں کام آ سکتا ہے جبکہ وہ اس قسم کا علم ہو جسکی تعریف قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے اور یہی علم کا وہ حصہ ہے جسے علم فطرت کہا جاتا ہے۔ سو جب تک اس حصۂ علم کی تکمیل نہ ہو اسلام کا کوئی عالم مکمل عالم نہیں بن سکتا۔ اسلام کے دور ترقی میں عالم کے لفظ سے کسی زاہد گوشہ نشین کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوا کرتا تھا۔ بلکہ عالم اور حکیم سے مراد اُس وقت وہی ہوتی تھی جو آج کل ریسرچ سکالر یا ڈاکٹر سے ہوتی ہے چنانچہ نظامیہ میں ایک طرف اگر امام غزالی دینیات کا درس دیا کرتے تھے تو دوسری طرف علامہ بہاؤ الدین ریاضی اور تاریخ پر لکچر دیتے تھے۔ خود مساجد میں اس قسم کے درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے مصر کے خلیفہ العزیز کے زمانہ میں جامع الازہر میں فلسفہ لٹریچر اور طبیعیات پر لیکچر دیئے جاتے تھے۔ اور اسی مکمل تعلیم کا اثر تھا کہ جس نے وہ قوم پیدا کر دی جس کے علمی احسانات سے تمام مہذب دنیا کی گردن جھک رہی ہے، اور جن کے علمی کارنامے۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے سب تمہارے تابع فرمان کر دیا) کی زندہ تفسیر ہے۔ یقین مانیئے اگر ہم بھی اپنے نظریئے کو بدل لیں اور علم کی صحیح تعریف کو اپنے پیش نظر رکھیں تو یہ زمین بدل جائے گی، یہ آسمان بدل جائے گا اور ایک دن ہم پھر یہ کہنے کے قابل ہو سکیں گے کہ ؎

زمین از گردش تقدیر ما گردوں شود روزے
فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

تنزیل وتاویل

سورۃ البقرۃ

(۱)

(از جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی)

اس سورت کو سورۂ بقرہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں ذبح بقرہ کا واقعہ مذکور ہے جو حق جل وعلا کی الوہیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے اس لیے کہ ایک مقتول کا محض ذبح کی ہوئی گائے کا ایک ٹکڑا لگا دینے سے زندہ ہو جانا، فقط اس فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ کے ارادہ اور مشیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا اور اگر کسی کو اس کی قدرت ومشیت میں شک ہے تو اس طریق سے اب کسی مقتول کو زندہ کر دکھائے۔ علاوہ بریں یہ واقعہ منکرین حشر اجساد کے لیے ایک عظیم الشان حجت ہے کہ وہ اس واقعہ سے عبرت پکڑیں اور خوب سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے وقت اسی طرح مردوں کو زندہ فرمائے گا۔ نیز حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعتبار سے یہ واقعہ ایک معجزہ تھا جو ان کی نبوت ورسالت کی تصدیق کے لیے من جانب اللہ ظاہر کیا گیا تھا۔ اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ صراط مستقیم کا اقتضا یہی ہے کہ بغیر تفتیش اور تفحص کے انبیاء کرام کی اطاعت کی جائے۔ انبیاء اللہ کی اطاعت سے انحراف ضلال مبین (کھلی گمراہی) ہے اور ان حضرات سے تعنت اور حجتیں کرنا موجب غضب اور لعنت ہے۔ اعاذنا اللہ من ذٰلک ۔ آمین۔

اللہ جل جلالہ کی ہدایت اور انبیاء کرام کی نصیحت جب ہی نفع دیتی ہے کہ دل میں خدا کا خوف اور ڈر موجود ہو

صراط مستقیم اور راہ حق کی تلاش ہوتی ہی اسوقت ہے جب کہ خدا کا خوف دل میں موجود ہو اور اس کے غضب اور لعنت سے بچنے کی فکر ہو ورنہ جس شقی اور بدبخت کا دل خدا کے خوف سے خالی ہے اس کے حق میں انبیاء کا ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے۔

الٓمّٓ

اس قسم کے حروف جو سورتوں کی ابتداء میں ذکر کیے جاتے ہیں ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں۔ سلف صالحین کے نزدیک یہ حروف متشابہات میں سے ہیں۔ ان کی مراد اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کما قال تعالیٰ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۔ ان متشابہات کی حقیقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

خلفائے راشدین اور دیگر حضرات صحابہ و تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے ایسا ہی منقول ہے (ابن کثیر)۔

بعض سلف اور جمہور متکلمین اور خلیل اور سیبویہ کے نزدیک حروف مقطعات ان سورتوں کے نام ہیں جن کی ابتداء میں یہ وارد ہوئے ہیں۔ جو مضامین اس سورت میں بالتفصیل مذکور ہیں یہ حروف مقطعہ بالاجمال ان پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ صحیح بخاری کا نام الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سننہ و ایامہ کتاب موصوف کے تمام مفصل مضامین کا ایک اجمال ہے۔

جس طرح مرکبات کلامیہ کا مفید معنی ہونا ان کے اجزاء یعنی کلمات مفردہ کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے اسی طرح کلمات مفردہ کا مفید معنی ہونا حروف ہجائیہ کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے۔ اور علی ہذا ترکیب معنی ترکیب کلام پر موقوف ہے۔ کلام میں جس درجہ ترکیب ہوگی اسی درجہ معنی میں بھی ترکیب ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مرکبات اضافیہ اور مرکبات توصیفیہ کے معنی میں اتنی ترکیب نہیں جتنی کہ مرکبات تامہ خبریہ کے معنی میں ترکیب ہے ترکیب لفظی کے انحطاط سے ترکیب معنوی میں بھی انحطاط آگیا۔

مرکبات اضافیہ اگرچہ فی حد ذاتہا مرکبات ہیں ....

مگر مرکبات تامہ خبریہ کے لحاظ سے فی الجملہ بسیط ہیں اور اسی نسبت سے اُن کے معنی میں بھی بساطت اور اجمال ہے مگر حروف ہجائیہ اصول لغات اور مادۂ کلمات ہونے کی وجہ سے انتہا درجہ کے بسیط ہیں پس اسی نسبت سے اُن کے معنی میں بھی انتہا درجہ کی بساطت اور غایت درجہ کا اجمال ہوگا۔ بغیر تفہیم الٰہی اور بدون تائید غیبی کے ایسے اجمال کا سمجھنا ناممکن اور محال ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ نے فوز الکبیر میں اسی مسلک کو اختیار فرمایا ہے۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات کے اسرار و رموز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اُنھیں حضرات پر منکشف ہوتے ہیں جو من جانب اللہ علوم نبوت کے خاص طور پر وارث بنائے گئے ہیں۔ بلکہ کسی وقت حروف مقطعات خود بخود وارثین علوم نبوت کے سامنے اپنے اندرونی اسرار و غوامض بولنے لگتے ہیں۔ جس طرح کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے دست مبارک پر سنگریزے تسبیح پڑھتے تھے اور گوہ اور ہرن آپ سے کلام کرتے تھے۔ باقی ہم جیسوں کا حروف مقطعات کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہنا اسکی ہرگز دلیل نہیں ہو سکتا کہ فی النفس الامر اور فی الواقع یہ حروف حقائق و معارف سے عاری ہیں (روح المعانی)۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ

کتاب حقیقت میں یہی ہے جس کے حق اور منزل من اللہ ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک اور شبہ نہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

الٓمّٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ — اس نازل کردہ کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔

اور خدا کی نازل کی ہوئی کتاب میں کبھی شک ہو ہی نہیں سکتا اور اگر کسی کو شک پیش آئے تو وہ اس کے فہم کا قصور ہے۔ خدا کی بھیجی ہوئی کتاب میں بھی اگر شبہ کی گنجایش نکل آئے تو پھر وہ کون سی کتاب ہے کہ جس پر یقین کیا جائے۔ ویل یومئذ للمکذبین فبای حدیث بعدہ یؤمنون۔

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی۔ مگر یہ آیت وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ

رنیہ الی اللہ - حجۃ الوداع میں دسویں تاریخ ذی الحجہ کو منی میں آخری تبع کے زمانہ سے یہود نبی آخر الزمان کے انتظار میں مدینہ منورہ آکر آباد ہوئے تھے۔ ان آیات میں انھیں کو خطاب ہے کہ یہ وہی کتاب ہے کہ جس کی خبر انبیاء علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں چنانچہ بہت سے علماء بنی اسرائیل جو حقیقت بیں علماء تھے وہ ایمان لائے اور جن کی قلوب ثمن قلیل اور دراہم معدودہ کی محبت میں گرفتار تھے وہ اس سعادت سے محروم رہے کما قال تعالیٰ شانہٗ۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۔ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۔

قرآن کو ہم نے بتفریق نازل کیا تاکہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے آہستہ آہستہ پڑھیں اور بتدریج ہم نے اسکو نازل کیا آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ۔ مگر وہ لوگ کہ جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے اُن کی حالت تو یہ ہے کہ جب ان پر اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو ٹھوڑیوں پر سجدہ میں گرجاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ سبحان اللہ بیشک خدا کا وعدہ (جو اس کتاب کے نازل کرنے کا تھا) وہ پورا ہو کر رہا۔ اور گریہ وزاری کرتے ہوئے ٹھوڑیوں پر گرتے ہیں اور ان کے خشوع میں اور اضافہ ہوتا ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

(صفات مومنین مخلصین) هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ - یہ جملہ ذالک الکتاب کی دوسری دلیل ہے یعنی کتاب حقیقت میں یہی ہے اس لیے کہ اول تو اس میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی گنجائش نہیں دوم یہ کہ یہ کتاب خدا کے عقاب و عتاب سے ڈرنے والوں کے لیے ایک نور مبین اور مشعل ہدایت ہے - سورۃ فاتحہ میں بندوں کی جانب سے خدا کی حمد و ثنا کا تذکرہ تھا - سورۃ بقرہ میں اس کے برعکس خدائے عز و جل کی جانب سے عباد متقین کی مدح و ثنا کا ذکر ہے۔ سبحان اللہ محض اپنی رحمت کاملہ اور فضل عمیم سے ایمان اور تقویٰ کی

توفیق عطا فرماتے ہیں۔ اور پھر خود ہی اُس کی توصیف فرماتے ہیں۔ اللھم لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک۔

لغت میں تقویٰ کے معنی صیانت اور حفاظت کے ہیں۔ اور اصطلاح شریعت میں اُن چیزوں سے جو آخرت میں ضرر رساں اور نقصان دہ ہوں، بچنے کا نام تقویٰ ہے۔ اور چونکہ ضرر کے درجات مختلف ہیں اسی اعتبار سے تقویٰ کے بھی مراتب مختلف ہیں۔

پہلا مرتبہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل اور کفر سے تائب ہو کر عذاب دائمی سے اپنے کو بچا لینا۔

دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ ارتکاب کبائر اور اصرار علی الصغائر سے اپنے نفس کو محفوظ رکھنا کسی نے کیا خوب کہا ہے:۔

خَلِّ الذُّنُوبَ صَغِيْرَهَا وَكَبِيْرَهَا ذَاكَ التُّقٰى

چھوٹے اور بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دے یہی تقویٰ ہے

وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ اَرْ ضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرٰى

راہ خدا میں اس طرح چل جس طرح کہ خار دار جنگل میں ڈر ڈر کر اور سنبھل سنبھل کر کوئی چلتا ہے

لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

چھوٹے چھوٹے گناہ کو بھی حقیر مت سمجھو چھوٹے چھوٹے سنگریزوں سے ہی پہاڑ بن جاتے ہیں

حضرت عمرؓ نے اُبیّ بن کعب رضؓ سے تقویٰ کی حقیقت دریافت فرمائی تو انھوں نے فرمایا کہ اے امیرالمومنین کیا کبھی کسی پر خار راہ سے نہیں گزرے؟ فرمایا کیوں نہیں۔ ابی بن کعبؓ نے کہا کہ اے امیرالمومنین پھر آپ نے اس وقت کیا کیا؟ فرمایا کہ میں نے دامن چڑھائے اور کانٹوں سے بچنے میں اپنی پوری جدوجہد کر خرچ کر ڈالا۔ ابی بن کعب رضؓ نے کہا کہ اے امیرالمومنین بس یہی تقویٰ ہے۔ یعنی حق جل وعلا کی معصیت اور نافرمانی سے بچنے کے لیے اپنی پوری ہمت اور طاقت کو خرچ کر دینا اسی کا نام تقویٰ ہے۔ اسی لیے ارشاد ہے:۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ یقیناً خدا کے نزدیک سب سے زائد عزت والا وہی ہے جو تم میں سے سب سے زائد پرہیزگار اور خدا سے ڈرنے والا ہے۔

تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ قلب کو ہر اُس چیز سے محفوظ کر لینا جو خدا سے غافل کرتی ہو۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ (اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) یہی تقویٰ مراد ہے۔

خدا کا خوف اور اس کے عقاب و عتاب کا ڈر ہی ہدایت کا مبدا۔ اور ہر قسم کے فوز و فلاح کا سرچشمہ ہے اسی لیے حضرت نوح اور حضرت ہود اور حضرت صالح اور حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم الصلوٰۃ والسلام نے سب سے پہلے اپنی قوموں کو یہ نصیحت فرمائی۔ اَلَا تَتَّقُوْنَ (کیا تم کو خدا کا خوف نہیں) اور فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ جیسا کہ سورۂ شعرا میں مذکور ہے۔ اس لیے کہ بغیر خدا کے خوف کے کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ کما قال تعالیٰ سَیَذَّکَّرُ مَنْ یَّخْشٰی۔ یعنی جو خدا سے ڈرتا ہوگا وہ جلد نصیحت قبول کرے گا۔

حق جل وعلا نے دوسرے موقعہ پر بجائے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے ھُدًی لِّلنَّاسِ (یعنی ہدایت ہے انسانوں کے لیے) ارشاد فرمایا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو متقی نہیں وہ انسان بھی نہیں انسانیت اور آدمیت کا اقتضا۔ یہ ہے کہ اپنے مالک اور خالق سے ڈرے اور جو اُس احکم الحاکمین سے نہیں ڈرتا وہ انسان نہیں بہائم کے مثل ہے بلکہ اُن سے بھی بدتر کما قال تعالیٰ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ۔

سفر آخرت کے لیے تقویٰ ہی کا توشہ اور تقوے ہی کا لباس کار آمد ہوتا ہے۔ کما قال تعالیٰ:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی سفر کیلیے توشہ لو پس تحقیق کہ سب سے بہتر توشہ تقویٰ ہے

جس طرح بغیر زادِ راہ کے مسافر کی ظاہری اور جسمانی حیات ناممکن ہے، اس سے کہیں زائد بغیر زاد تقویٰ کے مسافر آخرت کی معنوی اور روحانی حیات ناممکن اور محال ہے۔ اور جس طرح ایک معمولی راستہ سے

عریان اور برہنہ گزرنا خلاف حیا و شرم ہے اسی طرح اس عظیم الشان شاہراہ سے جو ایک لمحہ کے لیے بھی بے شمار ملائکۃ اللہ سے خالی نہیں ہتی لباس تقویٰ سے برہنہ اور عریاں گزرنا کس طرح بے حیائی اور بے شرمی نہ ہوگا۔ اعاذنا اللہ مِنْ ذٰلِکَ آمین۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ۔ یہ کلمہ المتقین کی صفت ہے۔ المتقین میں تمام بری باتوں کے ترک کی طرف اشارہ تھا اب امور خیر کا ذکر فرماتے ہیں۔ چونکہ اجزار انسان میں سب سے اعظم اور اشرف جزء قلب ہے اس لیے سب سے پہلے فعل قلب یعنی ایمان کا ذکر فرمایا۔ قرآن عظیم اور حدیث نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بے شمار نصوص سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان فعل قلب ہے۔ **کما قال تعالیٰ**:۔

مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ۔	بعض لوگ محض زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے۔ حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے۔
اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ۔	ایسے ہی لوگوں کے دلوں میں ایمان کو نقش کر دیا ہے۔
وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ	یہ کہو کہ اسلام لائے یعنی ظاہراً اطاعت قبول کی لیکن دلوں میں ابھی تک ایمان نہیں پہونچا۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا مشہور ہے:۔

اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰى دِیْنِكَ۔	اے اللہ میرے دلکو اپنے دین پر قائم رکھ

لغت میں ایمان کے معنی مطلق تصدیق کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں جن چیزوں کا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دین سے ہونا قطعی اور یقینی اور بدیہی طور پر ثابت ہوگیا محض نبی اور رسول کے اعتماد پر ان کی تصدیق کا نام ایمان ہے اور ایسے ہی امور کی تکذیب اور انکار کا نام کفر ہے مثلاً توحید و رسالت ختم نبوت حشر و نشر بعث و جزاء اور بہشت مخصوصہ اور ارکان معلومہ کے ساتھ نماز اور حج کا ادا کرنا وغیر ذٰلک جس طرح سے ان کا دین ہونا ثابت ہوا ہے اسی طریق پر اُن کی تصدیق و تسلیم ایمان کہلائیگی۔ اور اگر بالفرض کوئی شخص مثلاً

صلوٰۃ کا شعار اسلام اور عماد الدین ہونا بمعنی الدعاء تو تسلیم کرتا ہے مگر قیام، قعود اور رکوع و سجود یعنی اس ہیئۃ مخصوصہ کے ساتھ جو قطعی اور یقینی طور پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوتی ہے اس کی فرضیت اور اس کا شعار اسلام ہونا تسلیم نہیں کرتا تو یہ صریح کفر ہے۔ ایسے امور میں تاویل بھی معتبر نہیں۔ تاویل اسی جگہ معتبر ہے کہ جو قواعد و ضوابط کے ماتحت ہو ہوا و نفسانی اور معاذ اللہ انبیاء کرام کے ساتھ سوء ظن اور بدگمانی پر مبنی نہ ہو۔

عارف جامی شواہد النبوت کے پہلے ہی صفحہ پر حمد و نعت کے بعد فرماتے ہیں:-

"نخستین رکن از ارکان اسلام اقرار بکلمۂ شہادت است و حقیقت ایمان تصدیق بمضمون آن و آں مشتمل بر دو امر است یکے اقرار بوحدانیت حق سبحانہ و تعالی و گرویدن بآن۔ دوم اقرار بنبوت و رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم و گرویدن بآن و امر اول وقتے معتبر است کہ مقتبس از مشکوٰۃ نبوت باشد اگر بمجرد دلائل عقلی اکتفا کنند چوں فلاسفہ و از مشکوٰۃ نبوت نگیرند مفید نجات نیست"

امام غزالی قدس اللہ سرہ۔ فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ میں ایمان اور کفر کی یہ تعریف فرماتے ہیں:

الکفر ھو تکذیب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فی شیء مما جاء بہ والایمان تصدیقہ فی جمیع ما جاء بہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی شیٔ میں بھی تکذیب کرنے کا نام کفر ہے اور تمام امور میں آپ کی تصدیق کرنا اس کا نام ایمان ہے۔

امام غزالی قدس اللہ سرہ کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایمان کے لیے فقط ایک دو امور کی تصدیق کافی نہیں تمام امور میں رسول اللہ کی تصدیق لازم ہے۔ ہاں کفر میں تمام امور کی تکذیب ضروری نہیں ایک شیٔ میں بھی رسول کی تکذیب کفر ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک اہل ایمان اور اہل قبلہ وہی لوگ ہیں جو تمام امور میں رسول کی تصدیق کرتے ہیں۔ فقط قبلہ کی طرف نماز پڑھنے سے اہل ایمان اور اہل قبلہ کے زمرہ میں شمار نہیں کیا جائے گا جب تک تمام

امر کی تصدیق نہ کرے۔ کما قال تعالیٰ۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (الیٰ آخر الآیات)

نیکی اور بھلائی اس میں منحصر نہیں کہ تم اپنے چہرہ کو مشرق اور مغرب کی جانب پھیر لو۔ لیکن نیکی اور بھلائی یہ ہے کہ جو ایمان لائے اللہ پر اور یوم قیامت پر اور تمام فرشتوں پر اور اللہ کی ہر کتاب پر اور تمام پیغمبروں پر۔

الحاصل۔ شریعت کے نزدیک اہل قبلہ وہی لوگ کہلائیں گے جو تمام امور دینیہ کی تصدیق کرتے ہوں اور کسی امر دینی کے مکذب اور منکر نہ ہوں۔ جو شخص ضروریات دین میں سے کسی ایک امر کا بھی مکذب اور منکر ہو وہ شخص قطعاً ویقیناً دائرہ ایمان اور زمرۂ اہل قبلہ سے خارج ہے اگرچہ وہ شخص قبلہ رو ہو کر دن میں پچاس نمازیں ادا کرتا ہو۔ قال تعالیٰ:۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔

کیا تم کتاب کی بعض باتوں پر ایمان لاؤ گے اور بعض کا انکار کر دو گے؟ تو تم میں سے جو ایسا کرے گا اس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ حیات دنیا میں رسوائی اور قیامت کے دن ایسے لوگ زیادہ شدید عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں گے۔ اور اللہ غافل نہیں ہے اس سے جو تم کرتے ہو۔

ناظرین کرام! غور فرمائیں کہ آیت شریفہ میں دنیا کی رسوائی اور آخرت کا سخت سے سخت عذاب انہی لوگوں کے لیے ذکر فرمایا ہے جو کتاب الٰہی کے بعض احکام کی تصدیق اور بعض کی تکذیب کرتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ اخروی نجات کے لیے فقط بعض احکام کی تصدیق ہرگز کافی نہیں۔ پھر آگے ارشاد فرماتے ہیں:۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا
بِالْآخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ
وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا
مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ
وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ
بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ
بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا
كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ
بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ ۔

یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے حیات دنیا کو آخرت کے عوض خرید لیا ہے۔ پس ان پر سے عذاب کم نہ کیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جا سکے گی۔ اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کے بعد دوسرے رسول بھیجے اور عیسیٰ بن مریم کو کھلے ہوئے نشانات (معجزے) دیئے اور روح قدس سے اس کی تائید کی۔ تو پھر کیا تم ایسے ہو گئے کہ جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس تمہاری خواہشات کے خلاف کچھ لے کر آیا تو تم نے سرکشی کی پھر کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کرنے لگے؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں۔ نہیں، بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی ہے پس وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں جس خاص کفر پر لعنت فرمائی ہے وہ یہی کفر ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بجانب اللہ ایسی چیزیں لے کر آئے جو نفسانی خواہشوں کے خلاف ہوں تو یہود بے بہبود نے اس وقت سرکشی اور انبیاء کرام کی تکذیب کی۔

عارف ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ فلاسفۂ یونان جو سمٰوات و کواکب کے فنا و فساد کے قائل نہیں وہ قطعاً کافر ہیں جیسا کہ امام غزالی نے اپنے رسائل میں اس کی تصریح کی ہے اس لیے کہ یہ لوگ نصوص قطعیہ اور اجماع انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منکر ہیں۔ کما قال تعالیٰ:۔

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ وقال اللہ تعالیٰ إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ
وقال اللہ تعالیٰ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا۔

نمیدانند کہ مجرد تلفظ بکلمۂ شہادت و اسلام کافی نیست

نہیں جانتے کہ محض کلمہ شہادت پڑھ لینا مسلمان ہونے کے لیے کافی نہیں

تصدیق جمیع ما علم مجیئہ من الدین بالضرورۃ باید (مکتوبات صفحہ ۳۳۳)

مسلمان ہونے کیلئے اُن تمام چیزوں کی تصدیق کہ جن کا دین میں ہونا قطعی اور بدیہی طور پر ثابت ہو گیا لازمی اور ضروری ہے۔

الحاصل جو شخص ضروریات دین اور قطعیات اسلام کا منکر اور مکذب ہو وہ شخص اہل قبلہ سے نہیں

چنانچہ ردالمحتار (صفحہ ۵۷۲) میں ہے:۔

اهل القبلة فی اصطلاح المتکلمین من یصدق بضروریات الدین ای الامور التی علم ثبوتها فی الشرع واشتهر فمن انکر شیئا من الضروریات کحدوث العالم وحشر الاجساد وعلم الله سبحانه بالجزئیات وفرضیة الصلوة والصوم لم یکن من اهل القبلة ولو کان مجاهدا بالطاعات وکذلک من باشر شیئا من امارات التکذیب کسجود الصنم والاهانة بامر شرعی والاستهزاء علیه فلیس من اهل القبلة ومعنی عدم تکفیر اهل القبلة ان لا یکفر بارتکاب المعاصی ولا بانکار الامور الخفیة غیر المشهورة. هذا ما حققه المحققون فاحفظه۔

متکلمین کی اصطلاح میں اہل قبلہ وہ ہے جو ضروریات دین کی تصدیق کرے یعنی اُن امور کی جن کا ثبوت شرع میں معلوم و مشہور ہو چکا ہے۔ پس جس نے ضروریات میں سے کسی چیز مثلاً حدوث عالم اور حشر اجساد اور اللہ سبحانہ کے عالم جزئیات ہونے اور نماز روزہ کی فرضیت کا انکار کیا وہ اہل قبلہ میں سے نہیں ہے اگرچہ وہ طاعات میں کتنی ہی کوشش کرتا ہو اسی طرح جو شخص علامات تکذیب میں سے کسی فعل کا ارتکاب کرے مثلاً بت کو سجدہ کرنا اور کسی امر شرعی کی توہین کرنا اور اس کا مذاق اڑانا، تو وہ اہل قبلہ میں سے نہیں ہے اور اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ گناہوں کے ارتکاب یا چھوٹی چھوٹی غیر مشہور باتوں کے انکار پر کسی کی تکفیر نہ کی جائے گی یہ محققین کی تحقیق ہے۔ اسے یاد رکھو۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ
أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ
نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ
أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا أُولٰئِكَ
هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ
عَذَابًا مُّهِينًا وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ
وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولٰئِكَ
سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ
غَفُورًا رَّحِيمًا ۔

یقیناً جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ اور اُس کے رسولوں کا اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے۔ اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راہ اختیار کریں، وہ بالتحقیق کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیئے ایک رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور جنھوں نے ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کی ان کو عنقریب اللہ ان کے اجر عطا کرے گا۔ اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جو شخص بعض چیزوں پر ایمان لائے اور بعض پر ایمان نہ لائے وہ شخص پکا کافر ہے۔ فقط بعض چیزوں پر ایمان لانے سے اللہ کے نزدیک وہ مومن نہیں ہوتا۔

علی ہذا حلال قطعی کو حلال سمجھنا اور حرام قطعی کو مثلاً زنا اور لواطت۔ خمر اور خنزیر کو حرام سمجھنا یہ بھی ایمان کا جزو لاینفک ہے اور حلال قطعی کی حلت کا انکار اور حرام قطعی کی حرمت کا انکار صریح کفر ہے مثلاً اگر کوئی شخص زنا اور لواطت کی حرمت کا انکار کرے تو وہ شخص بلاشبہ کافر ہے۔ ہاں جن چیزوں کی حلت و حرمت ظنی ہو ان کے انکار سے کافر نہیں ہوتا۔ کما قال تعالیٰ:-

وَقَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا
بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ
اللّٰهُ وَرَسُولُهُ ۔

اور جنگ کرو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور یوم آخر پر، اور حرام نہیں سمجھتے اس چیز کو جسے اللہ اور اُس کے رسول نے حرام کیا ہے۔۔

(باقی)

من وسلوے

(از جناب مولانا عبداللہ العمادی)

چندسال ہوئے "ادبی دنیا" (لاہور) میں "من وسلویٰ" کے متعلق بحث چھڑی تھی، الٰہ آباد کے پروفیسر نعیم الرحمٰن اور پنجاب کے ایک پیشوائے جماعت نے "ابن الفارس" کے نام سے طویل و عریض افادات فرمائے تھے، جی چاہتا ہے آج اُسی "من" سے امتنان اور اُسی "سلویٰ" سے تسلی حاصل ہو۔ یہ بنی اسرائیل کے زمانہ کی بات تھی، آج ذوق توحید کیونکر اس سے لذت یاب ہو؟

(۱)

سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے:-

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ — (۱) ہم نے تم پر ابر کو سایہ گستر بنایا

وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ — (۲) ہم نے تم پر من وسلویٰ اُتارا

كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ — (۳) ہم نے جو پاک رزق تمہیں دیا ہے اُسمیں سے کھاؤ۔

وَمَا ظَلَمُونَا — (۴) ان لوگوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا۔

وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ — (۵) یہ تو خود اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے۔

یہاں "من" اور "سلویٰ" سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے ان گنت تاویلیں کی ہیں اور کیا کچھ روایتیں لکھی ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ عرب اس کا مفہوم کیا سمجھتے تھے؟ جاہلیت کے مشہور سخن گو "امیہ بن ابی الصلت" نے ایک شاندار نظم کی ہے جس میں دکھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب دیکھا کہ بنی اسرائیل "تیہ" میں تباہ ہو رہے ہیں تو اُن کو "من وسلویٰ" کی نعمت دی، یہ کیا چیز تھی؟ وہ اس کو یوں ظاہر کرتا ہے ؎

فرأى الله انهم بضيع ... لا بذي مزرع ولا معمورا

فنماها عليهم غاديات ... ويرى مزنهم خلايا وخورا

عسلا ناطفا وماء فراتا

وحليبا ذا بهجة مزمورا

ناطف:- رواں وسیال حلیب مزمور، صافی و زلال۔

امیہ کی رائے میں مَن و سلویٰ، رقیق شہد اور اس کا صاف پانی تھا۔

اس سے کم از کم اتنا تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ مَن و سلویٰ کے جو معنی ہماری تفسیروں میں مبسوط ہیں، عہد جاہلیت میں یہ معنی نہ تھے۔ بلکہ اس زمانہ میں اس کا کچھ اور ہی مطلب سمجھتے تھے۔

(۲)

علمائے محدثین کی تحقیق ملاحظہ ہو۔

ان عبارات المفسرين متقاربة في شرح المن، فمنهم من فسره بالطعام ومنهم من فسره بالشراب والظاهر- والله اعلم- انه كل ما امتن الله به عليهم من طعام وشراب وغير ذلك مما ليس لهم فيه عمل ولا كد [۱]

"مَن" کی تشریح میں مفسرین کی عبارتیں قریب قریب اور ملتی جلتی ہیں کسی مفسر نے "مَن" کی تفسیر کھانے کی چیز سے کی ہے اور کسی نے پینے کی چیزوں سے۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے، لیکن ظاہر معنی تو یہ ہیں کہ "مَن" سے ہر ایسی نعمت مراد ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ممنون فرمایا تھا، مثلاً کھانا، پانی وغیرہ تمام وہ چیزیں جن میں خود ان کے عمل و کوشش و محنت کو ذرا بھی دخل نہ تھا [۱]

اس کی تائید امام بخاری کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو سعید بن زید سے مروی ہے، قال قال

[۱] تفسیر ابن کثیر (علی ہامش فتح البیان) طبع بولاق، مصر، سنہ ۱۳۰۰ھ۔ ج ۱ ص ۱۶۱۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:۔ الکمأۃ من المن، وماؤھا شفاءٌ للعین، یہ حدیث بہت ہی تھوڑے لفظی اختلاف سے بیشتر محدثین اور خصوصاً اصحاب صحاح نے روایت کی ہے، اس میں نقطۂ بحث یہ ہے کہ "من"، جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا تھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم "کمأۃ" کو بھی اسی ذیل میں شامل فرماتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ:۔

(۱) من وہ نعمت ہے جو ممنونیت کا باعث ہو۔

(۲) کمأۃ میں بھی شفا کی خاصیت ہے، آشوب چشم والے اس کے منت پذیر ہیں۔

کمأۃ:۔ وہ برساتی روئیدگی جسے عوام چھتری کہتے ہیں، ہماری مجلس مصطلحات نے اس کا نام "فطر" رکھا ہے، کہ یہی قدیم عربی نام ہے۔

(۳)

"سلویٰ" کے کیا معنی ہیں؟ اسرائیلیات میں پڑنے کی ضرورت نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ "سلویٰ" کے معنی عرب کیا سمجھتے تھے عہد جاہلیت کا شہرۂ آفاق شاعر "ہذلی" کہتا ہے ؎

وقاسمھا باللہ جھداً لأنتم
ألذ من السلویٰ اذا ما نشورھا

اس میں سلویٰ کے معنی شہد کے ہیں۔

قال القرطبی: المؤرج احد علماء اللغۃ والتفسیر قال انہ (ای السلویٰ) العسل واستدل ببیت الھذلی ھذا وذکر انہ کذلک فی لغۃ کنانۃ لانہ یسلی بہ ومنہ عین سلوان ؎۱

علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ مؤرج جو لغت عرب و تفسیر قرآن کے عالم تھے کا بیان ہے کہ سلویٰ شہد کو کہتے ہیں ہذلی کے اسی شعر سے انھوں نے بھی استدلال کیا ہے۔ قبائل کنانہ کی زبان میں سلویٰ کے معنی شہد کے ہیں کیونکہ شہد ایسی چیز ہے جس سے تسلی ہوتی ہے اسی بنا پر ایک چشمہ کا نام بھی سلوان پڑ گیا، یعنی تسلی بخش چشمہ ؎۱

؎۱ تفسیر ابن کثیر، ج ۱ ص ۱۶۴۔

قرطبی کے استدلال میں ایک جھلک اس کی بھی ہے کہ سلوے کے اصل معنی تسلی کے ہیں۔ جو چیزیں تسلی بخش ہوں وہ بھی اسی میں آجائیں گی، سلوانہ میں بھی اسی تسلی کا مفہوم ہے:۔

شربتُ علی سلوانۃ ماء مزنۃٍ ۔۔۔ فلا وجدید العیش یا میّ لا اسلو

ایک دوا کا نام "سلوان" تھا اور ایک چڑیا کو "سلواۃ" کہتے تھے:۔

وانی لتعرونی لذکراک ھِزّۃٌ ۔۔۔ کما انتفض السلواۃ من بلل القطر

تسلی ہی کا مادہ سب میں ہے اور یہی اصل معنی ہیں۔

(۴)

امام راغب اصفہانی اسی لفظ "سلویٰ" کی تفسیر کرتے ہیں:۔

اصلها ما یسلّی الانسان ومنہ السلوان والتسلّی، وقیل السلویٰ طائرٌ۔

اصل میں سلویٰ وہ چیز ہے جس سے انسان کو تسلی ہو جائے سلوان اور تسلی کا اشتقاق اسی سے ہے، ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ سلویٰ ایک چڑیا ہے۔

پھر لکھتے ہیں:۔

واصل السلویٰ من التسلّی، یقال سلیت عن کذا، وسلوت عنہ، وتسلیت اذا زال عنک محبتہ [۵۱]

سلویٰ کی اصل تسلی سے ہے، دل سے جب کسی کی محبت جاتی رہی اور اس کی جانب سے تسلی آگئی تو محاورہ میں "سلیت عنہ" اور "سلوت عنہ" اور "تسلیت" کہتے ہیں [۵۱]

"منّ" اور "منت" کا مادہ ایک ہی ہے، منت کی توضیح کی ہے:۔

المنۃ النعمۃ الثقیلۃ [۵۲] ۔۔۔ منت بھاری نعمت کو کہتے ہیں [۵۲]

پھر بلفظ "قیل" فرماتے ہیں، جو اگرچہ تمریض کے لیے ہی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام راغب اسکی صحت کے قائل ہیں

---

[۵۱] المفردات فی غریب القرآن - طبع میمنیہ مصر سنہ ۱۳۲۴ھ ص ۲۴۱ [۵۲] المفردات - ص ۴۹۱ -

المنّ و السلوىٰ كلاهما اشارةٌ الى ما انعم الله به عليهم، وهما بالذات شيئٌ واحدٌ، لكن سمّاه منّاً بحيث انه امتن به عليهم، وسمّاه سلوىً من حيث انه كان لهم به التسلى [1]۔

من و سلویٰ دونوں سے اس نعمت کی جانب اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھی، یہ دونوں چیزیں بالذات ایک ہی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے "منّ"، اس لیے کہا کہ اس نعمت سے ان کو منت پذیر فرمایا تھا، اور سلویٰ اس حیثیت سے نام رکھا کہ یہ چیز اُن کے لیئے وجہ تسلی تھی۔

(۵)

اب علمائے عربیت و قدمائے ادب کی تصریح ملاحظہ ہو:۔

قال الزجّاج: جملة المنّ فى اللغة ما يمنُّ الله عز وجل به مما لا تعب فيه ولا نصب

زجاج کا قول ہے کہ "منّ" کے بہت سے معنی ہیں، ان سب کا مجمل ملخص یہ ہے کہ عربی زبان میں وہ تمام نعمتیں "منّ" ہیں جو بغیر کسی محنت و مشقت و کد و کاوش کے اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائی ہوں۔

وقيل: مما منّ الله به على عباده

یہ معنی بھی بیان کئے گئے ہیں کہ اللہ نے اپنے بندوں پر جو احسان کیا ہو وہ "منّ" ہے

وقال ابوبكر: قال المفسرون المنّ الترنجبين والسلوىٰ السمانى۔ قال والسلوىٰ عند العرب العسل وانشد

کتاب الجمہرہ کے مصنف ابوبکر بن دُرَید نے بیان کیا کہ مفسرین نے "منّ" کے معنی ترنجبین اور "سلویٰ" کے "سمانیٰ" (چڑیا) لیے ہیں، لیکن عرب میں تو سلویٰ شہد تھا، جس کی سند یہ ہے:۔

لو ابصرت المنّ والسلوىٰ مكانهم

ما ابصر الناس طعماً فيهم نجعا

حقیقت یہ ہے کہ اس مادّہ کے تمام مشتقات تسلی سخن ہیں، یعنی تسلی کا مفہوم سب میں ہے۔ کہتے ہیں:

[1] المفردات ۔ ۴۹۲۔

کہتے ہیں :۔ ھو فی سلوۃ من العیش، ای فی رخاءٍ

راعی :۔ اخو سلوۃٍ مسّی به اللیل املح،

ابوذویب :۔ علی ان الفتی الختمی سلّی

بنصل السیف غیبة من یغیب

رویہ :۔ مسلم ما انسالک ما حییت لو اشرب سلوان ما سلیت ما بی غنی عنک وان غنیت

ابن بری :۔ جعلت لعراف الیمامة حکمه وعراف نجد ان هما شفیانی

فما ترکا من رقیة یعلمانها ولا سلوة الا بها سقیانی

قال الفارسی :۔ السلوی کل ما سلاک وقیل للعسل سلوی لانه یسلیک بحلاوته وتأتیه عن غیره مما تلحقك فیه مؤنة الطبخ وغیره من انواع الصناعة

ابو علی فارسی کا بیان ہے کہ جو چیز تمہیں تسلی دے وہی سلویٰ ہے، شہد کو بھی اسی لیے سلویٰ کہا گیا ہے کہ اس کی حلاوت تسلی بخش ہے اور بغیر زحمت کے حاصل ہوتی ہے کہ نہ اس میں پکانے کی مشقت ہے اور نہ کسی دوسری قسم کی صنعت کا دخل ہے۔

مراۃ المثنوی

جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم۔ اے رکن دار الترجمہ

مثنوی مولانا روم

کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے عقائد اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جن کی مدد سے آپ حسب منشا جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے غرض اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایسی سہولت مہیا کر دی ہے کہ ہر شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور کر سکتا ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت عہ سکہ انگریزی لعہ سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمایئے

حاملان قرآن

قاضی طیّب عمادی

از

جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی ، بی ایس سی (علیگ)

وَنَحْنُ اُنَاسٌ کُلَّمَا غَابَ کَوْکَبٌ
بَدَا کَوْکَبٌ تَاْوِیْ اِلَیْهِ کَوَاکِبُهٗ

آل عماد کا طرز حیات یہ تھا کہ معارف نبوی میں یکتائی اور ارتقای روحانیت میں بے ہمتائی دوش بدوش رہے ، یہ امتیاز ہر عہد میں محمود رہتا چلا آیا اور کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہا ، البتہ یہ بزرگوار اس لیے بواطن حقایق پر ظواہر شرائع کو راجح رکھتے تھے کہ اگرچہ علم و عرفان دونوں بجائے خود محکم بالشان ہیں تاہم عالم کو عارف پر ترجیح ہے ، دیکھو اللہ تعالیٰ کو عالم کہتے ہیں مگر عارف نہیں کہہ سکتے کیونکہ علم کے مقابلہ میں معرفت اس کے دون مرتبہ ہے ۔

علوم نبوی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جتنے علوم حقہ ماثور یا مستنبط ہیں حضرت طیب ان سب کے حامل تھے اور صدلقیت میں تو شیخ کامل تھے ، تعلیمات ولایت پر اپنے والد سے فائز ہوئے اور تکمیل ظاہر و باطن کے بعد خلافت نبوی صلعم کا خاندانی میراث حصہ میں آیا ، مگر تقویم نسبت کے لیے اجازت خلافت حضرت شیخ محمد بن قطب بنیادل رضی اللہ عنہما سے حاصل فرمائی ، حضرت شیخ کی جناب میں آپ درجۂ خلّت رکھتے تھے ،

حضرت شیخ جب کسی کو مرید کرتے تو اس کی تعلیم آپ کے ذمہ ہوتی اور جب خلافت دیتے تو مثال خلافت پر آپ کے دستخط بھی ہوتے۔

حلقہ درس میں علمائے اعلام و شیوخ اسلام بکثرت شریک ہوتے، جامع میاں پورہ جو برلب دریائے گومتی حضرت شیخ قطب بینادل کی یادگار ہے وہیں آپ درس دیتے اور کلام اللہ و سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تفسیر فرماتے، خاندان کی زبان عربی تھی اس لیے عربی ہی میں کلام کرتے، اور عربیت بھی اس پایہ کی جس سے عبداللہ بن المقفع و عبدالحمید و جاحظ کی یاد تازہ ہوتی اور سامعین کچھ بھی فرق نہ کرسکتے، كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا۔

قضاء اسلام آوازۂ علم و غلغلۂ فضل اس قدر بلند ہوا کہ سلطنت کو کشش ہوئی اور بار بار فرمان طلب نافذ ہوا بار بار عذر کرنے پر بھی جب گلو خلاصی نہ ہوسکی تو حضرت شیخ محمد بن قطب نے ارشاد فرمایا کہ تم "قَاضِيَانِ فِي النَّارِ" سے کیوں ڈرتے ہو، "وَقَاضٍ فِي الْجَنَّةِ"، کیوں نہیں بنتے، امتثال امر شیخ لازم تھا اس لیے دربار شاہی میں حاضر ہوئے مگر اس شان سے کہ نہ آداب بجا لائے، نہ تین تسلیمیں کیں، نہ زمین بوس ہوئے وہ گردن پادشاہ کے لیے جھکائی جو اللہ ہی کے لیے جھکتی تھی، سلطنت کو بزرگداشت منظور تھی اس لیے کوئی ادا گراں نہ گزری اور خدمت قضائے بنگال پر مامور فرمائے گئے جہاں آپ کا مستقر عظیم آباد تھا کہ سقوط دولت شرقیہ کے بعد سرور پور کی ویرانی سے آباد ہوا تھا، تمام شرفا و ملوک سرور پور وہیں ہجرت کر گئے اور اسی کو اپنا وطن بنالیا، اس سے بیشتر آپ صاحب اولاد ہوچکے تھے مگر عظیم آباد میں حارث سادات عرب کے خاندان میں جو مہاجرین سرور پور کا سرگروہ تھا، ایک شادی کی اور اس سے بھی اولاد ہوئی جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، نشر نصفت و نفاذ عدل میں آپ کو نہایت انہماک تھا اور اپنے طرز عمل سے اپنے جد بزرگ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے منشور خلافت کو ممثل بنا دیا تھا کہ "حقوق کے معاملات میں جو قوی ہیں تا بحد حق رسانی میں ان کو ضعیف سمجھونگا اور جو ضعیف ہیں تا بحد حق رسی ان کو قوی کردوں گا۔"

اِس سے قبل امر نوا ایک وادی غیر ذی زرع تھا، آپ نے اُس کو شیخ عبد الغنی اور سید ناصر کی شرکت میں نوسَو روپے میں خرید فرمایا، ان میں ایک صاحب آپ کے برادر نسبتی اور دوسرے کو آپ کی خواہر منسوب تھیں ہبنامہ اب تک موجود ہے اور اس پر حضرت شیخ محمد بن قطب رضی اللہ عنہما کی عبارت شہادت بھی اُنھیں کے خط شریف میں بصیرت افروز باصرہ و زینت و برکت ہے۔

حضرت نے عظیم آباد ہی میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہیں، سقی اللہ ثراہ و افاض شآبیب رحمتہ علیٰ مثواہ۔

دیوان منسوب بعلی مرتضیٰ رضؓ معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو آداب فارسیت سے بھی آپ مستفید ہو چکے تھے، حکیم سید مظفر حسین صاحب (چھتہ بازار حیدر آباد) نے اُس دیوان کی شرح کا ایک نسخہ مجھے دکھایا جو امیر المومنین علی بن ابی طالب سے منسوب ہے۔ یہ نہایت پاکیزہ خط کا قلمی نسخہ ہے اور فارسی میں دیوان موصوف کی مکمل شرح کی ہے، عبارت خاتمہ یہ ہے :- کتبہٗ الفقیر الی اللہ طیب بن داؤد بن قطب بن جمال الجون پوری،، اور اسی کے تحت بخط طلسم کبھی یہی اعلام ثبت ہیں :-

"۲۱۹ ۵۲ ۴۶۶۱۴ ۵۲|۲۹ ۵۲ ۳۱۴۳ ۱۳۳۱ ۱۲۶۲ھ"

مجھے پہلے شبہ ہوا کہ یہ کسی دوسرے بزرگ کی تعریف ہوگی اس لیے کہ قاضی طیب تو حضرت داؤد بن قطب ابن عماد کے چشم و چراغ تھے اور یہاں بجائے عماد کے جمال مرسوم ہے، لیکن بعد کو انکشاف ہوا کہ جمال العالم حضرت شیخ عماد ہی کا خطاب تھا جو بیعت خلافت کے بعد بارگاہ بنبادل سے مرحمت ہوا تھا، اس کتاب کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ شرح ابیات کے ساتھ یہ بھی تشریح کر دی ہے کہ اخبار عرب میں یہ بیتیں فلاں و فلاں شعرائے قدیم سے مروی ہیں۔

مجلس درس قرآن آپ کی دو مجلسیں تھیں، ایک جس میں اس طرح فصل خصومات فرماتے کہ فضلائے عدل سے رایاس دشریح کو یاد دلاتے، دوسری مجلس درس تھی جس میں حقائق تنزیل کو دقائق تاویل سے بلند آوازہ کرتے

اور عکرمہ وابن عباس کا عہد تازہ کرتے، قریۂ زادبوم پر جب آپ نے دخل پایا تو اس آیت کو تلاوت فرمایا:-

دعائے ابراہیمؑ

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ -

وہ وقت یاد کرو جب ابراہیمؑ نے کہا:- اے میرے پروردگار اس شہر کو محل امن بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بچا کہ بتوں کی پرستش نہ کریں-

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ -

اے میرے پروردگار ان بتوں نے بہتیرے لوگوں کو گمراہ کردیا، اب جس نے میری پیروی کی وہ میری نسل میں سے ہے اور جس نے نافرمانی کی تو اے پروردگار فی الحقیقت تو ہی غفور رحیم ہے-

رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ -

اے ہمارے پروردگار میں نے اپنی نسل میں سے بعض کو تیرے عزت وحرمت والے گھر کے پاس ایک بے زراعت وادی میں ٹھیرایا ہے-

رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ، لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ

اے ہمارے پروردگار غرض یہ ہے کہ اقامت صلاۃ میں یہ لوگ مستقیم رہیں، لہٰذا تو کچھ لوگوں کے دلوں کو انکی جانب مائل کردے، اور کچھ پھل اور پیداوار ان کو روزی کر، کہ شاید وہ شکر کریں-

رَبَّنَا اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ

اے ہمارے پروردگار جو ہم چھپاتے ہیں اور جو علانیہ سامنے لاتے ہیں درحقیقت تو ان سب کو جانتا ہے اللہ سے کوئی چیز نہ زمین میں چھپی ہے نہ آسمان میں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاءِ -

اللہ کے لیے ہر طرح کی حمد ہے جس نے کبر سن کی حالت میں مجھے اسمٰعیل و اسحٰق بخشے حقیقت میں میرا پروردگار ہی دعا سننے والا ہے

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ...	اے میرے پروردگار مجھے اور میری نسل کے کچھ لوگوں کو اقامت صلاۃ پر ملتزم رکھ۔
رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ	اے ہمارے پروردگار یہ بھی عرض ہے کہ میری دعا کو قبول کر لے۔
رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ	اے ہمارے پروردگار میری، میرے والدین کی، اور تمام ایمانداروں کی اُس دن مغفرت کر جو حساب کا دن ہو گا۔

دعائے انبیاء طالبانِ حقیقت ہمیشہ فرصت کے منتظر رہتے تھے، حضرت سے گزارش کی: دعائے انبیا مقبول ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا کہ میری اولاد کو بت پرستی سے بچانا، کیوں قبول نہ ہوئی؟ قریش بھی تو اولادِ ابراہیمؑ تھے: دعا قبول ہوتی تو یہ پوری نسل بت پرستی سے ملوث ہوتی،

یہ بھی واضح ہے کہ جاہلیت میں اصحاب فیل اور اسلام میں قرامطہ نے مکۂ مبارکہ پر حملے کیے، پھر یہ دعا کہاں پوری ہوئی کہ اس شہر کو امن واماں میں رکھنا؟

فرمایا:- مفسرین نے تو بہتیری توجیہیں کی ہیں، مگر قولِ فیصل یہ ہے کہ ہندوستان میں آ کر اولاد کا مفہوم بہت وسیع ہو گیا، حضرت ابراہیمؑ کی دعا یہ تھی وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ (مجھے اور میرے بیٹوں کو بچانا) اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے بیٹوں کو کہ اسمٰعیل و اسحٰق تھے (علیہم السلام) عبادت اصنام سے بچائے رکھا،

بلدِ آمن فرمایا:- رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا — اے میرے پروردگار اس شہر کو امن میں رکھنا،

اس کی تفسیر میں یہ روایت بطریق صحیح وارد ہے:-

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمَّا فَرَغَ مِنْ بِنَاءِ الْكَعْبَةِ ذَكَرَ هٰذَا الدُّعَاءَ	تعمیر کعبہ شریف سے فارغ ہونے کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی تھی۔
وَالْمُرَادُ مِنْهُ جَعْلُ تِلْكَ الْبَلْدَةِ آمِنَةً مِنَ الْخَرَابِ	مراد یہ تھی کہ یہ شہر ویرانی سے محفوظ رہے۔

وھی عامرۃ للاٰن، لاتخربھا الفتن، مَاظھر منھا ومابطن،	خدا کے فضل سے یہ شہر اب تک آباد ہے ظاہری باطنی کسی طرح کے فتنے اسے ویران نہ کرسکے۔

اولاد غیر صالح فرمایا:۔ اولاد ہونے میں اولاد ابعید بھی نسبت قریب سے کچھ بہت دور نہیں، مگران کے یہ ابراہیم علیہ السلام نے خود ہی تصریح کردی کہ جو میرے پیرو ہیں وہی میری اولاد میں شامل ہیں نافرمان اولاد کو یہ تو نہیں فرمایا کہ وہ میری نسل ہی سے نہیں، البتہ یہ ضرور فرمایا کہ ایسے لوگوں کا اللہ مالک ہے جو غفور بھی ہے اور رحیم بھی، فمن تبعنی فھو منی، ومن عصانی فانك غفورٌ رحیم۔

وادی غیر ذی زرع میں سکونت کی مصلحت عرض کی:۔ اس میں کیا مصلحت تھی کہ حضرت ابراہیم؈ اپنی بیوی اور بیٹے کو ایک دشت بے آب وگیاہ میں چھوڑ گئے؟

فرمایا:۔ معتزلہ بھی یہی اعتراض کرتے ہیں، قاضی جبائی کا قول ہے:۔

اکثر الامور المذکورۃ فی ھذہ الحکایۃ بعیدۃ لانہ لایجوز لابراھیم علیہ السلام ان ینقل ولدہ الی حیث لا طعام ولا ماء مع انہ کان یمکنہ ان ینقلھما الی بلدۃ اخری۔	اس کہانی کی اکثر باتیں حقیقت سے دور ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے یہ جائز نہ تھا کہ وہ اپنے فرزند کو ایسی جگہ منتقل کرتے جہاں نہ کھانے کی چیزیں تھیں نہ پانی تھا، ہوسکتا تھا کہ بیٹے اور بیوی دونوں کو کسی دوسرے شہر میں منتقل کردیتے۔

اس کا جواب ضروری نہیں، اس باب میں جیسا اعتراض حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ شانہ پر بھی ایسا ہی ایراد وارد ہوگا کہ خروج مصر کے بعد بھی بنی اسرائیل کو سالہا سال ایک دشت بے آب وگیاہ میں کیوں سرگرداں رکھا؟

اگر یہ کہیے کہ وہاں تو منّ وسلویٰ کا نزول تھا، تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہاں بھی تو رزق ثمرات ومیلان قلوب کی نعمت عظمیٰ عطا ہوئی تھی۔

اصل یہ ہے کہ خلافت الہٰی کے لیے مومنین ایسے ہی مقامات میں تربیت پاتے اور تیار کیے جاتے ہیں، وہاں بھی یہی ہوا اور یہاں بھی یہی ہوتا رہے گا۔

درحضرتِ کریم تمنّا چہ حاجت است

فرمایا:- ابراہیم علیہ السلام کی تمنا تو یہ ہے کہ ان کی اولاد کو صلاح و فلاح نصیب ہو، مگر اسکے لیے دعا نہیں کرتے، اللہ کی ثنا کرتے ہیں، کہ دل کی آرزو اللہ پر خود روشن ہے۔

کأنہ کان فی قلبہ ان یطلب من اللہ علیتہما	ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے جی میں یہ آرزو
واعانۃ ذریتہما بعد موتہ ولکنہ لم یصرح	تھی کہ اللہ سے دعا کریں میرے مرنے کے بعد میری بیوی اور
بھذا المطلوب بل طفق یحمد اللہ ویثنی علیہ	بیٹے اور ان کی اولاد کا اللہ مددگار رہے، لیکن انھوں نے
وذالک یدل علی ان الاشتغال بالثناء عند	علانیہ ایسی دعا نہ کی، بلکہ اللہ کی حمد و ثنا کی، اس سے یہ
الحاجۃ الی الدعاء افضل من الدعاء	مطلب نکلتا ہے کہ جہاں دعا کی ضرورت ہو وہاں ثنائے
	الہٰی میں مشغولیت دعا سے بھی بڑھ کر ہے۔

شکر تو اقبل ولادت! عرض کی:- ابراہیم علیہ السلام نے جب اسمٰعیل و ہاجرہ علیہما السلام کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑا ہے تو اسوقت تک حضرت کے دوسرے فرزند اسحاق علیہ السلام کی ولادت نہیں ہوئی تھی، پھر حضرت کا یہ فرمانا کہ اللہ کو حمد ہے جس نے کبرسن میں مجھے دو بیٹے اسمٰعیل و اسحٰق عطا کیے، کیا معنی رکھتا ہے؟

فرمایا:- آیت میں کہیں مذکور نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ اسوقت فرمایا جب اسمٰعیل و ہاجرہ علیہما السلام کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ کے چلے تھے۔

ان ابراھیم علیہ السلام انما ذکرھا	یہ اسوقت کی بات نہیں جب ابراہیم علیہ السلام نے
الکلام فی زمان آخر، لا عقیب ما تقدم	بیوی بچے کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑا تھا اور ان کے
من الدعاء	لیے دعا کی تھی، یہ دوسرے وقت کی دعا ہے۔

رسائل ومسائل

حدیث لاتسبوا الدھر

مکرمی - السلام علیکم - رسالہ ترجمان القرآن شعبان ۱۳۵۳ھ میں جنابنے حدیث شریف اوبر الشیطان لہ ضراط کے سلسلہ میں جو تحریر فرمایا ہے اس کا مفصل جواب عنقریب جناب کی خدمت میں پہونچیگا۔ کیونکہ آپکا یہ جواب ناتسلی بخش ہے اور صحیح بھی نہیں ہے۔ کاش آپ کامل توجہ فرماتے اور مناسب عالمانہ جواب دیتے اور علماء اہلحدیث پر اللہ اور اسلام کو ترجیح دیتے۔ نیز مزید گزارش ہے کہ اسی سلسلہ میں آپ مندرجہ ذیل استفسار پر بھی توجہ فرماویں:-

۱ بخاری شریف کی حدیث ہے - فان اللہ ھو الدھر ۲ و قال اللہ یسبنی بنو آدم الدھر و انا الدھر ۳ مؤطا امام مالک - فان اللہ ھو الدھر ۴ و حدیث ترمذی لو انکم دلیتم بحبل الی الارض السفلی لھبط علی اللہ - ان سے ظاہر ہے کہ دہر ہی بخاری صاحب وغیرہ کا معبود (الہ) ہے اور ان کا (الہ) صرف دہر ہے اب فرمایئے ان دہر کو اپنا معبود (الہ) ماننے والوں کی بابت آپ کا کیا فتویٰ ہے؟ راغب اصفہانی کی سند زیر نظر رکھکر جواب مرحمت کیا جائے۔ ھل الدھر الا لیلۃ و نھارھا - و الا طلوع الشمس ثم غیارھا جس کی رو سے تو نظام شمسی کواکب کرہ ارض عناصر ہی دہر نیچر - زمانہ ہیں جنکی بابت کفار دہریے کہا کرتے تھے و قالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت و نحیا و ما یھلکنا

اِلَّا الدَّھرُ وَمَا لَھُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (سورۃ الجاثیہ، ۲۳)

برائے مہربانی ان کو مسترد نہ فرمایئے نہ چھپایئے بلکہ اس مختصر عریضہ کو مکمل چھاپیئے اور عالمانہ

جواب مرحمت فرمایئے۔ فقط والسلام۔ ابراہیم حنیف داعی الی اللہ از لاہور۔

آپ کے اصل استفسار کا جواب دینے سے پہلے اُس طرز عمل کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو آپ نے اس مسئلے میں اختیار کیا ہے۔

میں نے آپ کا وہ مضمون پڑھا ہے جو آپ نے عیسائیوں کے رسالہ المائدہ میں "روایتی نماز کی فلاسفی" کے عنوان سے لکھا ہے۔ آپ کے جذبات کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن کم از کم میرے اپنے جذبات یہ ہیں کہ اگر مجھے خدانخواستہ اپنے کسی مسلمان بھائی سے جھگڑا کرنا بھی ہوگا تو غیر مسلموں کے سامنے جا کر کبھی ایسا نہ کروں گا۔ کجا کہ وہ جھگڑا کسی مذہبی مسئلہ ہی پر ہو، اور اس سے غیر مسلموں کو اسلام اور مسلمانوں پر استہزاء کرنے کے لیے اچھا خاصا سامان تفریح ہاتھ آتا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی مسلمان بھی جس میں ذرا سی بھی اسلامی غیرت ہوگی ایسا کرنا پسند نہ کرے گا۔ بلکہ مجھے تو ابھی تک عیسائیوں، ہندوؤں، اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں میں بھی کوئی مثال ایسی نہیں ملی کہ کسی شخص نے خود اپنے ہم مذہبوں کے مذہبی عقائد کا مذاق اڑانے یا ان پر لعن وطعن کرنے کے لیے کسی دوسرے مذہب والوں کے اخبار کو ذریعہ بنایا ہو۔ پھر آپ تو ماشاء اللہ "داعی الی اللہ" ہیں۔ ابراہیم حنیف آپ کا اسم گرامی ہے۔ آپ کی غیرت نے یہ کس طرح گوارا کیا کہ مسلمانوں سے مذہبی مسائل میں جھگڑا کرنے کے لیے ان لوگوں کے رسالہ کو واسطہ بنائیں جو اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اور اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ کے قائل ہیں؟ جن کے سامنے ایک داعی الی اللہ کو تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی دعوت پیش کرنی چاہیے تھی، ان کے سامنے آپ اپنے آپس کے اختلافات پیش فرما رہے ہیں، اور وہ بھی اس انداز میں کہ دوسروں کی نگاہوں میں جمہور مسلم کے عقائد اور ان کے مذہب کا استخفاف ہو۔

آپ نے اپنے مذکورہ بالا مضمون میں جو زبان استعمال کی ہے اور جس انداز سے حدیث زیر بحث اور اسکی صحت کے قائلوں اور عموماً حدیث کے ماننے والوں پر نقد فرمایا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آج کل مذہبی مناظرے کا جو عام رنگ ہے اسی قسم کے مناظرے کی اسپرٹ آپکے اندر بھی بھری ہوئی ہے۔ اس اسپرٹ کا اظہار آپکے مندرجہ بالا خط سے بھی ہوتا ہے۔ نیز آپ کا یہ فعل بھی اسی اسپرٹ کا ایک مظہر ہے کہ آپنے یہ خط رجسٹری کے ذریعہ سے میرے نام ارسال فرمایا ہے۔ گویا خط بھیجنے سے پہلے ہی اپنے مخاطب کے متعلق آپ کافی بدگمان تھے، اور اس کے مقابلہ میں قانونی احتیاطیں برت لینا ضروری سمجھتے تھے تاکہ آیندہ اس پر گرفت کی جاسکے۔ اس ذہنیت اور اس جنگی روح کو دیکھ کر میں نہ چاہتا تھا کہ آپکے اس عنایت نامے کی طرف توجہ کروں کیونکہ میں پیشہ ور مناظر نہیں ہوں۔ زبانی اور قلمی کشتیوں کے دنگل آراستہ کرنا میرا شیوہ نہیں۔ جس مباحثہ کا مقصد احقاق وتحقیق نہ ہو اس میں ایک منٹ صرف کرنا بھی تضیع اوقات سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میرا ضمیر مجھے مجبور کر رہا ہے کہ آپ کی اصلاح خیال کے لیے کم ازکم ایک مرتبہ کوشش ضرور کی جائے۔

آپ اپنے عنایت نامے کی ابتداء میں فرماتے ہیں کہ حدیث ادبر الشیطان لہ ضراط کی شرح میں جو کچھ میں نے عرض کیا تھا وہ نا تسلی بخش ہے۔ اس عدم تسلی کی وجہ تو میں آپکے مفصل جواب کو دیکھ کر ہی سمجھ سکوں گا۔ لیکن اتنا آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ آپ کو تسلی بخشنا میرا یا کسی انسان کا کام نہیں ہے۔ دوسرا شخص جو کچھ کرسکتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ تسلی حاصل کرنے میں آپ کی مدد کرے۔ باقی رہی تسلی، تو اس کا سرچشمہ خود آپکے اپنے نفس میں موجود ہے۔ اگر آپ تسلی حاصل کرنا ہی نہ چاہیں، اور اپنے دل کے کان اور دل کی آنکھیں ہر اس آواز اور ہر اس چیز کے لیے بند کرلیں جو آپکے پہلے سے جمے ہوئے خیالات کے خلاف ہو، تو کسی انسان میں یہ قدرت نہیں کہ آپ کو مطمئن کرسکے۔ ہم معمولی انسانوں کا تو کیا ذکر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ان لوگوں کو مطمئن نہ کرسکے جنھوں نے مطمئن نہ ہونا چاہا۔ لہذا سب سے پہلے اپنے نفس کی طرف توجہ فرمایئے۔ اگر وہ اطمینان اور تسلی حاصل کرنا چاہتا ہے تو کھلے دل سے اور تحقیق کی نیت سے بحث فرمایئے اور

اگر وہ اس متاع کا طالب ہی نہیں ہے تو اس کام میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع نہ کیجئے۔

اب میں آپ کے اصل سوال کی طرف آتا ہوں، اور اس پر کلام کرنے سے میرا مقصد آپ پر صرف اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ تعصب کی عینک چڑھا کر محض سرسری نظر سے کسی چیز کو دیکھنا اور ایک قطعی رائے قائم کر لینا کس قدر غلط طریقہ ہے، اور اس سے انسان کس قدر گمراہ ہو جاتا ہے۔ آپ کے ارشادات کا حاصل یہ ہے کہ :۔

(۱) امام مالک اور امام بخاری وغیرہ حضرات جنھوں نے اس مضمون کی احادیث کو روایت کیا ہے، دراصل ان روایات کے واضع ہیں اور یہ حدیثیں انھوں نے خود گھڑ کر نبی اکرم کی طرف منسوب کر دی ہیں۔

(۲) ان روایات میں جس دھر کو برا کہنے سے روکا گیا ہے اس سے مراد زمانہ ہے یا نیچر جس میں نظام شمسی، کواکب، کرہ ارض، اور عناصر سب آجاتے ہیں۔ پس ان احادیث کے وضع کرنے والے اور اس کو ماننے والے دراصل دہریئے اور نیچری تھے۔

(۳) یہ حدیث دہریوں کے اس اعتقاد کی تائید کرتی ہے جس کی تردید قرآن مجید نے کی ہے۔

ان تینوں بدگمانیوں کی حقیقت ترتیب وار ملاحظہ ہو :۔

(۱) اس مضمون کی کم و بیش پندرہ سولہ روایتیں مختلف طریقوں سے امام مالک، امام احمد ابن حنبل امام بخاری، امام مسلم، اور امام ابو جعفر ابن جریر طبری نے نقل کی ہیں۔ ان تمام احادیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اور اس بات پر جمہور اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ صحابہ سب کے سب عدول ہیں۔ ان میں سے کسی پر یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا باندھا ہوگا۔ حضرت ابوہریرہ سے جن لوگوں نے ان روایات کو لیا ہے ان میں محمد بن سیرین، سعید بن المسیب، ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن اور اعرج جیسے لوگ ہیں۔ اس کے بعد ہر مرتبہ روایت میں راوی بڑھتے جاتے ہیں اور کئی طریقوں سے یہ روایتیں ائمہ مذکورین تک پہنچتی ہیں جن میں سے اکثر کے صحیح

ہونے پر اتفاق کیا گیا ہے، اور یہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی ضعیف روایت کی تائید میں کوئی قوی روایت موجود ہو تو وہ ضعیف بھی قوی ہو جاتی ہے۔

ایک طرف اتنی شہادتیں ہیں۔ اور دوسری طرف آپ کا صرف یہ مختصر سا فیصلہ کہ تمام روایتیں جعلی ہیں، کیوں؟ صرف اس لیے کہ جو مضمون ان روایات میں بیان ہوا ہے وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ روایات اور شہادتوں کو جانچنے کا یہ بالکل نیا طریقہ ایجاد ہوا ہے کہ جو روایت آپ کی سمجھ میں نہ آئے یا جس کا مضمون آپ کی رائے کے خلاف ہو، اُسکو بلا تکلف غلط اور اس کے راوی کو بے تامل جھوٹا کہہ دیجئے۔ کیونکہ صداقت کے لیے لازم ہے کہ وہ آپ کی رائے اور سمجھ کے عین مطابق ہو۔ معلوم نہیں کہ یہ حق آپ نے صرف اپنے لیے محفوظ رکھا ہے، یا ہر سامع کو فرداً فرداً یہی حق عطا فرماتے ہیں۔ اگر پہلی صورت ہے تو آپ اس کے مستحق ہیں کہ تمام دنیا کے دائمی قاضی قرار پائیں۔ کیونکہ اور کوئی شخص اس کا اہل نہ ہوگا کہ کسی گواہ کی جرح یا تعدیل کر سکے۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو شہادتوں اور روایتوں کو جانچنے اور ان کو صحیح یا غلط قرار دینے کے لیے دنیا میں کوئی متفق علیہ معیار نہ رہیگا بلکہ ہر شخص جس کو چاہے گا سچا اور جس کو چاہے گا جھوٹا کہہ دیگا، اور اسکی زد سے خود آپ بھی نہ بچ سکیں گے۔

آپنے اپنے اس قاعدے کے مطابق جن لوگوں کو کذاب اور واضع حدیث، اور رسول اللہ پر بہتان گھڑنے والے اور دہری زنجیری قرار دیا ہے، وہ امت مسلمہ کے سب سے زیادہ نامور اور ممتاز بزرگوں میں سے ہیں اپنے تقویٰ، دینداری، صداقت، خدمت دین، اور علمی تحقیق و کاوش کے لحاظ سے ان کا درجہ اتنا بلند ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد مسلمانوں کی پوری تاریخ میں شاید ان سے زیادہ بلند پایہ شخصیتیں آپ کو نہ مل سکیں گی۔ یہ مسلمانوں کے وہ ہیرو ہیں جن پر وہ تمام دنیا کی قوموں کے مقابلے میں فخر کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف زبان کھولنے اور بدترین قسم کے کذب و افترا کا الزام لگانے اور اس سے بھی بڑھ کر کفر اور دہریت کا فتویٰ صادر کرنے سے پہلے آپ کو کافی غور و خوض اور بحث و تحقیق سے کام لینا چاہیئے تھا، اور ذرا اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیئے تھی کہ کہیں آپ خود تو غلطی پر نہیں ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ کو

غلطی سے بالکل مبرا نہیں سمجھتے تو امام مالک، اور امام احمد ابن حنبل جیسے لوگوں پر اتنے بڑے الزامات عائد کرتے ہوئے آپ کو خدا سے ڈرنا چاہیئے تھا کہ اگر آپ خود غلطی پر ہوئے تو خدا کے ہاں اس گناہ کی کیسی سخت باز پرس ہوگی۔ کیا ایک ''داعی الی اللہ'' کے دل میں اللہ کا اتنا بھی خوف نہ ہونا چاہیئے؟

(۲) آپ نے حدیثوں کے آدھے آدھے ٹکڑے نقل کر کے ان کو بالکل غلط معنی پہنائے ہیں۔ ذیل میں ان تمام حدیثوں کو نقل کیا جاتا ہے جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ ان کو ترجمے کے ساتھ پڑھ کر بتلایئے کہ ان سے دہریت کی تائید نکلتی ہے یا صریح اور شدید تردید۔

بخاری کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ جاثیہ، اور کتاب التوحید میں ہے :-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ عز و جل یوذینی ابن آدم یسب الدھر وانا الدھر بیدی الامر اقلب اللیل والنھار	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عز و جل کا ارشاد ہے کہ ابن آدم مجھ کو اذیت پہنچاتا ہے کہ زمانے کو برا کہتا ہے۔ زمانہ تو میں ہوں۔ تمام معاملات میرے ہاتھ میں ہیں۔ میں ہی لیل و نہار کو گردش دیتا ہوں۔

طبری نے یہی حدیث دو طریقوں سے نقل کی ہے مسلم اور احمد ابن حنبل نے بھی اسکو لیا ہے۔

''یوذینی'' کی تشریح میں قرطبی نے کہا ہے کہ انما ھذا من التوسع فی الکلام۔ والمراد ان من وقع ذلک منہ تعرض لسخط اللہ۔ واللہ منزہ عن ان یصل الیہ الاذی۔

بخاری کتاب الادب باب لا تسبوا الدھر میں ایک دوسری سند سے یہ روایت آئی ہے :-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ یسب بنو آدم الدھر وانا الدھر بیدی اللیل والنھار۔	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بنی آدم زمانے کو برا بھلا کہتے ہیں، حالانکہ زمانہ میں ہوں لیل و نہار میرے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

طبری نے ایک دوسرے طریقے سے یہی حدیث نقل کی ہے مسلم نے بھی تھوڑے سے لفظی تغیر کے ساتھ

اس کو نکالا ہے۔

مسند امام حنبل اور تفسیر ابن جریر طبری، میں مختلف طریقوں اور تھوڑے سے لفظی اختلاف کیساتھ یہ حدیث آئی ہے

لا یقولن احدکم یا خیبة الدھر فانی انا الدھر اقلب لیلہ ونھارہ واذا شئت قبضتھما۔

تم میں سے کوئی ہائے زمانہ نہ کہے کیونکہ زمانہ تو میں خود ہوں اسکے لیل و نہار کو میں ہی گردش دیتا ہوں اور جب چاہوں گا اسکو ختم کردونگا

امام احمد بن حنبل نے ایک دوسرے طریقے سے یہ حدیث نقل کی ہے:۔

لا تسبوا الدھر فان اللہ قال انا الدھر الایام واللیالی لی اجددھا وابلیھا واٰتی بملوک بعد ملوک۔

زمانے کو گالیاں نہ دو۔ کیونکہ اللہ فرماتا ہے کہ زمانہ میں خود ہوں رات اور دن میرے ہی قبضہ قدرت میں ہیں انکو میں ہی نیا اور پرانا کرتا ہوں، بادشاہوں کے بعد بادشاہوں کو لاتا ہوں

مسلم اور طبرانی میں ہے:۔

لا تسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر

زمانے کو برا نہ کہا کرو کیونکہ اللہ ہی زمانہ ہے۔

موطا امام مالک باب مایکرہ من الکلام میں ہے:۔

لا یقولن احدکم یا خیبة الدھر فان اللہ ھو الدھر۔

تم میں سے کوئی ہائے زمانہ نہ کہے کیونکہ اللہ ہی زمانہ ہے۔

اب فرمائیے کہ دھریت اور نیچریت ان احادیث سے کہاں نکلتی ہے؟ ان کا مفہوم تو یہ ہے کہ تم پر جو مصائب ونوائب آتے ہیں ان کو تم اپنی جہالت سے زمانے کی طرف منسوب کرتے ہو۔ اور کہا کرتے ہو کہ زمانے نے ہم کو مٹا دیا۔ گردش لیل ونہار نے ہم کو تباہ کر ڈالا حالانکہ تمام افعال کا فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ لیل ونہار جن کی گردش کا نام زمانہ ہے، اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ لہذا تم جو زمانے کو گالیاں دیتے ہو تو دراصل وہ گالیاں خدا کی طرف راجع ہوتی ہیں، کیونکہ وہ زمانہ جس کو تم مصیبت اور راحت لانے والا سمجھتے ہو، وہ اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے، اور وہ زمانہ جو گردش لیل ونہار سے عبارت ہے حقیقت میں کسی فعل پر بھی قادر نہیں

کیا یہی بات ہے جس کو آپ دھریت اور نیچریت سے تعبیر فرما رہے ہیں؟ کیا اسی سرمایۂ فہم و تدبر کے ساتھ جناب کو یہ جرأت ہوئی کہ اسلام کے جلیل القدر ائمہ پر حملہ آور ہوں؟

ذرا غور تو کیجیے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان احادیث میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ضرور ادا ہوا ہوگا اور مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے ہوا ہوگا۔ کیونکہ مصیبت کے وقت زمانے کو کوسنا اور برا بھلا کہنا اب بھی عوام کی عادت ہے اور عہد رسالت میں اہل عرب کی بھی یہی عادت تھی، چنانچہ خود قرآن مجید شہادت دیتا ہے کہ عرب کے جہلاء زمانے کو ہلاک اور فنا کرنے والا سمجھتے تھے پس تکلیفوں کے وقت عام دستور کے مطابق مسلمانوں کی زبان سے بھی زمانے کی شکایت ضرور نکل جاتی ہوگی، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان کو اس سے یقیناً منع فرماتے ہونگے۔ اس میں کونسی ایسی انوکھی بات ہے جو بالکل خلاف عقل اور بعید از امکان ہو اور اسکی بنا پر ان روایات کو غلط اور ان کے راویوں کو جھوٹا قرار دینا ضروری ہو جائے؟

(۳) قرآن مجید کی جو آیت آپ نے نقل کی ہے وہ ان احادیث کے خلاف نہیں بلکہ انکی مؤید ہے۔ اس آیت میں کفار عرب کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "ہماری جو کچھ بھی زندگی ہے اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم مرتے اور جیتے ہیں اور زمانے کے سوا کوئی ہم کو ہلاک کرنے والا نہیں ہے"، اس قول کو نقل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ" ان کو اس کا کوئی علم نہیں ہے بلکہ یہ صرف ان کا گمان ہے" قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ" یعنی اے محمد! ان سے کہدو کہ تمہارا مارنے اور جلانے والا جس کو تم جہالت سے دھر کہہ رہے ہو وہ اللہ ہی ہے، پھر وہی تم کو قیامت کے روز جمع کریگا"۔ اوپر احادیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے کیا وہ یہی مضمون نہیں ہے؟

اب آپ ضد اور تعصب کو چھوڑ کر اپنے دل کی طرف رجوع کیجئے اور سوچیئے کہ بغیر کسی غور و فکر اور بغیر کسی تحقیق کے آپنے اللہ کے ان محبوب بندوں پر جھوٹ اور دھریت کے جو الزامات عائد کیے ہیں وہ کس قدر غلط ہیں اور ان پر آپ کو اللہ کے ہاں کیسی سخت جوابدہی کرنی ہوگی، ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ آپ کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور آئندہ کے لیے آپ کے قلب و زبان و قلم کو ایسی گمراہی سے محفوظ رکھے، اور آپ کو حقیقی معنوں میں داعی الی اللہ بنائے۔

مطبوعات

قرآن مجید ایک معجز نما کتاب ہے | از مولوی محمد عبد البصیر صاحب متقی آزاد سیوہاروی ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ۸ - پتہ منیجر رسالہ پیشوا، دہلی

اس رسالے میں لائق مصنف نے قرآن مجید کے اعجاز پر سات جہتوں سے بحث کی ہے اور بدلائل ثابت کیا ہے کہ قرآن شریف ہر حیثیت سے ایک معجز نما کتاب ہے۔ جہات اعجاز، جن پر صاحب رسالہ نے کلام کیا ہے یہ ہیں۔ قرآنی فصاحت و بلاغت۔ قرآن کا ایک مضمون دوسرے مضمون سے مغلوب نہیں ہوتا۔ قرآن کا بلحاظ نظم و اسلوب خود اس کے معجز نما ہونے پر دال ہے۔ قرآن مجید ہر فن میں غایت فصاحت و بلاغت پر ہے۔ قرآنی اعجاز۔ قرآنی پیشین گوئیاں۔ حفظ القرآن۔

ایوان | مرتبہ جناب مجنون گورکھپوری حجم ۸۰ صفحات، تقطیع کلاں۔ قیمت سالانہ للعہ۔ پتہ ایوان اشاعت گورکھپور

رسالہ ایوان، اردو کا مشہور ماہنامہ ہے۔ دو برس ملتوی رہکر جولائی ۱۹۳۴ء سے پھر نکلا ہے۔ ایوان نے اپنی گزشتہ زندگی میں بھی علم و ادب کی مفید خدمت انجام دی تھی، اس زندگی میں بھی اسی نقش قدم پر گامزن ہے۔ "داستان یوسف" "دنیائے انسانیت کا امکانی مستقبل"، "موجودہ اقتصادی ہیجان"، بہت اچھے مضامین ہیں۔

ماہ تمام | اڈیٹر جناب محمد اسحٰق صاحب امرتسری حجم ۷۰ صفحات - قیمت سالانہ للعہ پتہ ۱-۹ - بی، کنائی اسٹریٹ، کلکتہ

یہ مصور رسالہ کلکتہ سے "اردو زبان کے درجہ پست و زبون کو بلند کرنے" نکلا ہے۔ اب تک چھ نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ مضامین کا بیشتر حصہ انگریزی زبان کے رسائل کے مضامین اور افسانوں کے ترجموں اور ملخصات پر مشتمل ہے۔ رسالہ بحیثیت مجموعی اچھا ہے۔

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے۔ ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹری نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن بدر الدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع وناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی)   (مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن)